قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اِکہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

مئی 2014ء

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۖ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝

(النجم:41-39)



انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہو گی۔ جیسی جدوجہد، اسی قسم کے اس کے نتائج۔ خدائی پیمانہ کے مطابق معاوضہ صرف محنت کا ہوگا۔ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس کا نتیجہ یقیناً سامنے آ کر رہے گا۔ کسی کی محنت کے ثمرہ میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدل ملے گا۔

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
5

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ○ (ص:54)

یقینی طور پر یہ ہمارا عطا کردہ رزق ایسا ہوگا جس میں کوئی کمی نہیں آئے گی جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔



جلد 67 شمارہ نمبر 5 مئی 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: کیا وہ لوگ موجود ہیں؟	ادارہ	3
اقبالؒ کا مردِ مومن	غلام احمد پرویز	5
مذہبی پیشوائیت	ملک منظور حسین لیل	17
تخلیق کی نورافشانی	راجہ عبدالعزیز	26
الھدایۃ والعرفان فی تفسیر القرآن بالقرآن	آصف جلیل	38
باب المراسلات	شیخ اللہ دتا، راجہ عبدالعزیز محمد اقبال	45

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Qiyamah* – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 29: Chapter 24 Translated by: Dr. Mansoor Alam 59

دفتر کا پتہ B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546، 042-35764484

E-mail: idara@toluislam.com

انتظامیہ

ناشر وقائم مقام چیئرمین محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8 1c

ادارہ

لمعات

کیا وہ لوگ موجود ہیں؟

مزدوروں کے مسئلہ کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ نہ یورپ کے پاس ہے نہ چین کے۔ اس کا علاج نہ مزدوروں اور محنت کشوں کی ہڑتالوں میں ہے نہ ان کے ساتھ مفاہمت میں۔ اس سارے فساد کی جڑ ''مزد'' (اُجرت) کا غلط نظریہ ہے' اور جب تک یہ نظریہ باقی ہے' یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس کا حل صرف قرآن کے معاشی نظام میں مل سکتا ہے جس کی بنیاد حیاتِ آخرت کے ایمان پر ہے۔ اس نظام میں ہر فردِ معاشرہ محنت کش یا کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے اور ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا ''صلہ'' ملتا ہے لیکن یہ صلہ اُجرت کی شکل میں نہیں ہوتا۔ یہ صلہ ملتا ہے یہاں کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ پرورش اور آخرت کی زندگی کے مدارج کے تعین کی شکل میں۔ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک دیکھ جایئے' اس میں صلہ یا بدلہ عمل کا ملتا ہے۔ ''مذہب'' کی دنیا میں (عمل کی جمع) اعمال سے مراد چند مخصوص رسمیں ہوجاتی ہیں لیکن عمل کے سیدھے سادے معنی کام ہیں۔ اور جب کوئی کام' دین کے پروگرام کے مطابق کیا جائے تو وہ عملِ صالحہ بن جاتا ہے۔ ان اعمال (کاموں) کا بدلہ اس دنیا میں' رزقِ کریم (باعزت روٹی) کی شکل میں ملتا ہے' اور آخرت میں خوشگوار زندگی کی صورت میں۔ لہٰذا اسلامی معاشرہ میں ہر فرد' کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے۔ وہ کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں تک طبعی زندگی کی ضروریات کا تعلق ہے' یہ قریب قریب ہر انسان کی یکساں ہوتی ہیں۔ وہ کونسا قانونِ فطرت ہے جس کی رُو سے کہا جائے گا کہ مل کے مالک کے بچے کے لئے ناشتہ میں دودھ' انڈے' مکھن' توش' پھل ضروری ہیں اور مزدور کے بچے کے لئے سوکھی' باسی روٹی کا ٹکڑا کافی۔ خدا نے تو ان دونوں بچوں کا نظامِ پرورش ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ تفریق رزق کی غلط تقسیم کی پیدا کردہ ہے' جس کا جواز اجرت کے نظریہ کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

کارل مارکس کو بھی اس کا احساس ہوگیا تھا کہ صحیح معاشی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اجرت کا تصور ہے اس لئے اس نے کہا تھا کہ صحیح نظام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام اور ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ کے اصول پر قائم ہوسکے گا۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ آپ اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کا طریق کیوں نہیں بتاتے یا رائج نہیں کرتے' تو اس نے کہا کہ مجھے وہ بنیاد نہیں ملتی جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوسکے۔ اس لئے میں سردست اسے معرض التوا میں رکھتا ہوں۔ شاید ''زمانے کے

تقاضے‘ انسان کو اُس مقام تک لے آئیں۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کارل مارکس نے بات تو سمجھ لی تھی لیکن اسے اس کی اساس نہیں ملتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام ’’بات سمجھ لینے‘‘ سے قائم نہیں ہو سکے گا۔ جس نظام کو محض قانون کے زور پر قائم ہونا ہو‘ اس کے لئے ’’سمجھ لینا‘‘ کافی ہوتا ہے۔ لیکن جس نظام کا سرچشمہ ’’دل کی گہرائیوں‘‘ سے پھوٹتا ہو‘ اسے سمجھ لینے کے بعد‘ ایمان کی حیثیت سے قبول کرنا اولین شرط ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ جو قرآن کا نظام اس جماعت (کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اس جماعت) کے اندر قائم ہوتا ہے‘ جس کے افراد حیاتِ آخرت کو ایمان کا درجہ دے چکے ہوں — ’’ایمان‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی عمل‘ اقدارِ خداوندی کے خلاف نہ ہو۔ اس قسم کے افراد کو قرآنِ کریم نے مومنین‘ اور ان پر مشتمل جماعت کو اُمتِ مسلمہ کہہ کر پکارا ہے۔

لہٰذا‘ سوال اتنا ہی نہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے! یہ طے ہو جانے اور سمجھ میں آ جانے کے بعد بھی‘ اصلی سوال یہ ہوگا کہ کیا وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھوں اور جن کے اندر‘ یہ نظام عملاً متشکل ہوگا۔ یعنی وہ لوگ جن کا خدا کے قانونِ مکافات (حیاتِ آخرت) پر یقینِ محکم ہو!

☆.....☆.....☆

ENJOY YOUR STAY AT

HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.

NEAR RAILWAY STATION LAHORE



ALL COMFORTS AVAILABLE

- T.V. & FAX
- AIR-CONDITIONED
- TELEPHONE EXCHANGE
- CAR PARKING
- LIFT, INTERNET
- EXCELLENT SERVICE

PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,
E-mail:hotel_parkway@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے بندۂ مومن! تو کجائی! تو کجائی!

اقبالؒ کا مردِ مومن

آخری قسط

علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کی تقریب
پرویز صاحب کا خطاب (اپریل 1974ء)

عملِ تخلیق

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ خدا کی ایک صفت فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ہے یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت خدا کے لئے مختص ہے اور انسانی ذات، خواہ وہ کتنی ہی نشوونما یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔

حیوانی سطح پر افزائش نسل کا ذریعہ تولید ہے۔ یعنی جنسی اختلاط۔ خدا اس سے بلند و برتر ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ [112:3] اس کی ذات افزائش کے طریق تولید سے بلند و بالاتر ہے۔ لیکن انسانی نسل کی افزائش، طریقِ تولید کی رُو سے ہوتی ہے اس اعتبار سے حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن پیدائش کا ایک اور طریق ہے جسے عملِ تخلیق کہا جاتا ہے۔ تخلیق کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ جو عناصر موجود ہیں ان میں مختلف تراکیب سے امتزاج کے ذریعے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ خدا نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے علاوہ اور خالق ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کا عملِ تخلیق، خدا کے تخلیقی نوادر جیسا حسین نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا احسن الخالقین ہے۔ اس سے تین نکات ہمارے سامنے آئے۔ (1) فاطر صرف خدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ (2) عملِ تولید حیوانی سطح پر طریقِ افزائش ہے اور (3) مومن عملِ تخلیق میں خدا کا رفیق ہوتا ہے۔ تولید میں صرف تکرار ہوتی ہے۔ اس کی رُو سے ہر حیوان، جس میں انسان بھی شامل ہے، صرف اپنے جیسا بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں ندرت نہیں ہوتی۔ ارتقاء نہیں ہوتا۔ فکر کی دنیا میں اسے تقلید کہتے ہیں یعنی جو ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح ہوتا چلا جائے۔ تخلیق کے لئے نئی فکر، نئے خیال، نئی آرزوئے، نئے نئے مقاصد کا دل میں اُبھرنا، نئی نئی تمناؤں کا بیدار ہونا، شرطِ اوّلیں ہے۔ آپ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے جب تک آپ کے دل میں اس کے لئے ایک نیا خیال نہ اُبھرے۔ مومن کی زندگی تخلیقی کارناموں کا مظہر ہوتی ہے۔ تقلید و تکرار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے پیغام کا نقطہ ماسکہ تخلیقِ مقاصد اور بیداریٔ آرزو ہے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف ''اسرارِ خودی'' کے ابتدائی باب میں کہتے ہیں کہ

زندگانی رابقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

اور

مازِ تخلیق مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

عملِ تخلیق کے لئے زندگی کے بلند مقاصد پر یقین ضروری شرط ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را لذتِ تخلیق نیست

اقبالؒ کے نزدیک ایمان کا فطری نتیجہ تخلیقِ مقاصد ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ

ہر کہ اورا لذتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومن کارگہِ کائنات میں اپنے عملِ تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اقبالؒ مردِ حُر یا بندۂ آزاد کہتا ہے۔ اس کے برعکس، غلام ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

کیشِ اُو تقلید و کارش آذری ست
ندرت اندر مذہبِ اُو کافری ست
تازگی ہا وہم و شک افزائدش
کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

حضرت علامہ فکر کی تازگی کی اہمیت کے متعلق کہتے ہیں کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس کی تشریح (بالِ جبریل میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:۔

ندرتِ فکروعمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب ندرتِ فکر وعمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکروعمل سے معجزاتِ زندگی ندرتِ فکروعمل سے سنگِ خارا، لعلِ ناب

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا تھا کہ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ [35:1] وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ مومن بھی ندرتِ فکروعمل سے نئی نئی ایجادات سے، خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ پولینڈ کا مفکر، باردیو اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ ''امرِ تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا بھی انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے''۔ (THE DIVINE AND THE HUMAN)

نسل و رنگ

اب تولید و تخلیق کے فرق کا اگلا مرحلہ دیکھئے:۔

جہاں تک انسان کی تمدنی زندگی کا تعلق ہے، تولید کی حیوانی سطح پر، افراد کا باہمی رشتہ خون اور نسل کے اشتراک کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک خاص نسل کے گھوڑے، خاص نسل کے بیل، خاص نسل کی بھیڑیں، الگ الگ نوع قرار پاتی ہیں۔ ان میں نسلی اشتراک کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ جب انسان بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے تو وہ بھی خون اور نسل کے اشتراک سے مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ مومن کی سطح پر آ جائے تو پھر ان میں وجہ جامعیت خون اور نسل کا اشتراک نہیں رہتی۔ اقدار کا اشتراک وجہ جامعیت یا معیارِ قومیت قرار پاتا ہے۔ اس کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کریں، ایک قوم کے افراد اور جو لوگ مومنانہ سطح پر زندگی بسر کریں، دوسری قوم کے اراکین۔ ماں، باپ، زن و فرزند، اعزا و اقارب سے تعلقات، معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس تقاضا اور اقدارِ خداوندی میں ٹکراؤ۔ ہو تو یہ تعلقات یا یوں کہئے کہ خون اور نسل کا اشتراک، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن ان رشتوں کو بلا تامل توڑ کر، ان لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ [9:23] اے جماعت مومنین! اگر تمہارے ماں باپ یا بھائی بند، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں تو تم ان سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ رکھو۔ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [9:23] یاد رکھو! جو ایسا نہیں کرے گا اور ان سے بدستور دوستانہ تعلقات وابستہ رکھے گا تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہوگا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

قومِ تو از رنگ و خوں بالا تراست قیمتِ یک اسودش صداحمر است
گر نسب را جزوِ ملت کردۂ رخنہ در کارِ اخوت کردۂ (بے خودی)

یعنی

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

میں چونکہ اس موضوع پر سالہا سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان اشارات سے آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام میں قومیت کا مسئلہ سیاسی یا تمدنی سوال نہیں۔ یہ کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا انسانی سطح پر..... حیوانی سطحِ زندگی کو کفر کہا جاتا ہے اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی سطحِ زندگی کو ایمان۔ قرآن کے عبادؔ اللہ اور اقبالؒ کے مردانِ مومن کا ایک امتیازی جوہر یہ بھی ہے کہ وہ خون اور نسل کے حیوانی رشتہ کے بجائے ایمان و اقدار کے انسانی (مومنانہ) رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

رحم اور قوت

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ دنیا میں رحمؔ اور قوتؔ دو ایسے عناصر ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ اکٹھے ہو ہی نہیں

سکتے۔ عیسائیت نے خدا کو سرتا سر رحم قرار دیا ہے اور قوت کے ہر قسم کے تصور کو شر سے تعبیر کیا۔ خدا کے اس تصور نے جس قسم کا ضابطہ اخلاق مرتب کیا' اس کے نتائج وعواقب کے متعلق عصر حاضر کا ایک عظیم مفکر ''وسائٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:۔

اس ضابطہ کو اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

(ADVENTURES OF IDEAS)

اس تصور کے خلاف ردِّعمل کا انتہائی مظہر جرمن فلاسفر نیٹشے ہے جس کے نزدیک ''زندگی کا راز'' قوت اور بے پناہ قوت میں ہے۔ وہ اس خصوصیت کے سوا کسی قدر کا قائل ہی نہیں۔ اس تصورِ حیات نے کیا نتائج پیدا کئے' اس کی زندہ شہادت وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہیں۔ خدا ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ [51:58] یعنی بے انتہا محکم قوتوں کا مالک بھی ہے اور اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ [7:151] بھی۔ یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صاحب قوت ہے اور مظلوم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے انتہائی شفقت ورحمت کا مظہر۔ عبد مومن خدا کی ان دونوں صفات کا حامل ہوتا ہے اور اقبالؒ نے ان صفات کے حسین وجمیل امتزاج کو مختلف اسالیب وانداز سے اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ اگر میں اس کی تفصیل میں جانا چاہوں تو اس کے لئے کئی نشستیں درکار ہوں گی۔ قرآن نے جماعت مومنین اور ان کے سربراہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ خدا کے پیغامبر محمدؐ اور ان کے رفقاء کی کیفیت یہ ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [48:29] وہ حق وصداقت کے مخالفین کے لئے چٹان کی طرح سخت ہیں اور باہمدگر' حریر واطلس کی طرح نرم۔ اقبالؒ ان متضاد خصوصیات اور ان کے امتزاج کو انتہائی وجد کیف کے عالم میں بیان کرتا چلا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم کی وہ تابندہ نظم جس کا مطلع ہے..... ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن..... اور جس کے چند اشعار میں اس سے پہلے پیش خدمت کر چکا ہوں۔ اس کے آخر میں کہا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بانگِ درا کی مشہور نظم..... طلوعِ اسلام..... میں وہ' مسلمان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ:۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر وپرنیاں ہوجا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

قیام وسجود

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ [48:29] اس کے بعد قرآنِ کریم نے فدائیوں کی اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی کہ تَرٰىھُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا [48:29] تو انہیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں جھکے ہوئے کبھی سجدہ میں گرے ہوئے۔ علامہ اقبالؒ مومن کی صلوٰۃ سے کئی نادر معانی اخذ کرتے ہیں۔ وہ کبھی کہتے ہیں کہ

بسوزد مومن از سوزِ وجوش کشوِ ہر چہ بستند از کشوش
جلالِ کبریائی در قیامش جمالِ بندگی اندر سجودش

عبد مومن کے قیام وسجود کے جلال و جمال کے حسین منظر سے میرے افقِ ذہنی پر بلا ساختہ افغانستان کی ایک شاعرہ پری بدخشی کی غزل کا ایک شعر نمودار ہوگیا۔ اس نے کہا ہے اور دیکھئے کس ساحرانہ انداز میں کہا ہے کہ

برخاستی! قیامتِ کبریٰ بلند شد
بنشیں دمے! کہ فتنۂ محشر نشستہ بہ

لیکن اقبالؒ کسی اور ہی مقام سے بات کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز کا ایک قطعہ آپ نے بھی ابھی سن لیا۔ اسی مضمون کا دوسرا قطعہ ہے کہ

دو گیتی راصلا از قراتِ اوست مسلماں لا یموت از رکعتِ اوست
نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز قیامت ہاکہ در قد قامتِ اوست

مومن کا قیام وسجود آئینہ دار ہے اس حقیقت کا کہ وہ ایک خدا کے حضور جھک کر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہوجاتا ہے۔ سجدہ اگر بغیر قیام کے ہو تو وہ عیسائیت (بلکہ یوں کہئے کہ) مسلکِ رہبانیت کے ''خدا'' کا خود ساختہ تصور ہے۔ اور اگر قیام بلا سجدہ ہو تو وہ نیٹشے کے تصور کا (SUPERMAN) ہے جو اندھی قوت کا قہرمانی مجسمہ ہوتا ہے۔ قرآن نے قوت اور اقدارِ خداوندی کے امتزاج کو نہایت بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ [57:25] ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت اور میزانِ عدل دے کر بھیجا تا کہ لوگ عدل وانصاف کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن اس مقصد کے لئے نظری تعلیم یا پند ونصائح کافی نہیں تھے۔ اس لئے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ ہم نے ان کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی نازل کی۔ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ [57:25] اگر اسے خدا کے نازل کردہ ضابطہ ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ضابطہ خداوندی اور اس کے ساتھ تلوار (یعنی مادّی قوت)۔ یہ ہے اسلام۔ تلوار کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تنہا تلوار، بیت زندگی کا صرف ایک مصرع ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرا مصرع نہ ہو، یہ شعر نہیں بن سکتا۔ وہ دوسرا مصرعہ اقتدارِ خداوندی کا ضابطہ ہے۔ اقبالؒ نے اپنی زندہ و پائندہ تصنیف، جاوید نامہ میں تلوار اور قرآن کے باہمی تعلق کو ایسے عمیق لیکن درخشندہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آ جاتا ہے (مغلیہ خاندان کے) شاہ عالم کے زمانہ میں، پنجاب کے گورنر، نواب خان بہادر خان کی صاحبزادی محترمہ شرف النسا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ کمر سے تلوار باندھے رکھتی تھیں اور ہاتھ میں قرآن۔ اور انہوں نے اپنی والدہ کو وصیت کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں اس کی قبر کے اوپر رکھ دی جائیں۔

اقبالؒ اپنے آسمانی سفر میں، جنت الفردوس میں اس شہزادی والا تبار سے ملتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے ان شعارِ زندگی اور آخری وصیت کی حکمت کیا تھی۔ وہ جواب میں کہتی ہیں کہ میں تلوار اور قرآن کو اس لئے ساتھ رکھتی تھی کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگراند کائناتِ زندگی را محور اند!
مومناں را تیغ با قرآن بس است تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است

تلوار سے مراد، عسکری قوت ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اقتدار ہے۔ جب دین بلا اقتدار کے ہو تو وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا منتہیٰ وعظ و نصیحت کی منت خوشامد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اقتدار ضابطہ خداوندی سے الگ ہو جائے تو وہ ہر دَور میں فرعونیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اس جلال آفریں نظم کو پڑھئے اور دیکھئے کہ حکیم الامت نے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

واضح تر الفاظ میں کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مومن کی سیاست دین کے تابع رہتی ہے۔ قرآن اس کی تلوار کا محافظ ہوتا ہے کہ وہ بے راہ رَو نہ ہونے پائے اور تلوار قرآن کی محافظ کہ وہ مذہب بن کر نہ رہ جائے۔ اس طرح مومن کی تلوار اس کی قوت، اس کا اقتدار، اس کی سیاست، اس کی مملکت، دنیا میں مقاصد خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے مظلوموں نے اپنی امداد کے لئے خدا سے فریاد کی تو اس نے کس طرح مدینہ کے صاحب اقتدار مسلمانوں سے کہا کہ تم ان مظلوموں کی فریاد کو سنتے نہیں! تم اُن کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

مومن کو خدا کے قانونِ مکافات کی محکمیت پر بھروسہ ہوتا ہے اور خدا کو جماعت مومنین کی استقامت اور پامردی پر بھروسہ کہ جب یہ مشیتِ خداوندی کے بروئے کار لانے کے لئے اٹھتے ہیں' تو اس کی (مشیت) بروئے کار آ کر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اور سن رکھو کہ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ یہ خدا کی پارٹی ہے اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [58:22] اور سن رکھو کہ خدا کی پارٹی کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ صرف کامیاب ہی نہیں فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ [5:56] یہ سب پر غالب آ کر رہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کوئی قوم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے بڑھنا تو ایک طرف' کوئی قوم ان کے ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ [3:139] جب تم مومن ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا [4:141] یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنوں پر غالب آ جائیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر واضح ہے کہ دنیا میں (خدا کی طرف سے) حقِ حکومت صرف جماعت مومنین کو حاصل ہوگا۔ کسی اور کو نہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے' اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھال لیتا۔ وہ اس ماحول کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے اور مومن دنیا میں سب سے بڑا انقلابی ہوتا ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں ہے کہ

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — بامزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد بامزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیب نوذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ تو کہ باشد سازگار

اس قسم کا انقلاب، مردِ مومن کا ایمان ہی برپا کرسکتا ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(MARTIN BUBAR) نے اس حقیقت کو جس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، جی نہیں چاہتا کہ اس کیف میں آپ کو شریک کئے بغیر آگے بڑھا جائے وہ کہتا ہے کہ

جب قوتِ تخلیق ہم پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلا کر ہمارے اندر جذب ہو جاتی ہے اور اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہماری تخلیقِ نو کرتی ہے۔ ہم اس کے آتشیں جلال کے حضور میں پہلے کانپتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں۔ سربسجود ہو جاتے ہیں[1]۔ لیکن اس کے بعد ہم خود عملِ تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں اور خالق سے جا ملتے ہیں اس کے معاون اور رفیق کی حیثیت سے۔ (I AND THOU)

اس قسم کا جہانِ نو، مردِ مومن کی قوتِ بازو ہی سے وجود میں آ سکتا ہے۔ ایسا انقلاب کوئی اور پیدا نہیں کرسکتا جس میں کیفیت یہ ہو کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ [14:48] یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ [14:48] اور ان میں ایک نئی دنیا اُبھرے جس میں صرف خدائے واحد کا سکہ رواں ہو۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا [39:69] اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ ہیں وہ مردانِ حر جو ہیگل کے ''روحِ زمانہ'' اور مارکس کے ''تاریخی وجوب'' کے تابع مجبور و مقہور زندگی بسر کرنے کے بجائے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ باربیو کے الفاظ میں:۔

یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی جیتا ہے اور اس میں باعمل و متحرک رہتا ہے لیکن تاریخ اور کائنات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنے ارادوں کے تابع ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی ذات کی یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گردوپیش ہوں بلکہ تمام نوعِ انسان کے مقدمات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

(THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن کے الفاظ میں وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ [2:143] اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو۔

یہ ہے مومن کا مقام اِس دنیا میں اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلتی ہے، اس لئے جہانِ فردا میں بھی امامت کا سزاوار یہی ہوگا۔ اس لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

---

[1] بوبر چونکہ یہودی ہے اس لئے اس کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ طور کی طرف ہے۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

بانگ درا میں ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور بالِ جبریل کی یہ قصیدہ وسرائیندہ غزل۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ وبو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں!

قرآنِ کریم کی رُو سے تو' جنت بھی مومن کے سفرِ حیات کی آخری منزل نہیں' راستے میں ستانے کا مقام ہے۔ یعنی دم لے کر آگے چلنے کا مقام۔ کاروانِ حیات نے اس کے بعد بھی کئی ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔ اسی لئے اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ **نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ** ان کی (پیشانی کا) نوران کے آگے اور دائیں بائیں راستے روشن کرتا جائے گا۔ **يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا** [66:8] اوران کی پکار یہ ہوگی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے' ہمارے نور کی تکمیل کردے۔ اس نورانی سفر کی آخری منزل کونسی ہوگی' اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس لئے کہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح پر یہ حقیقت ہمارے حیطہ ادراک میں آنہیں سکتی تھی۔ اس کی سمت کا اشارہ کرتے ہوئے اتنا کہا گیا کہ **وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى** [53:42] اس سفر کا منتہیٰ تیرے ربّ کی طرف ہے۔ یاد رہے کہ اہل تصوف کا جو نظریہ ہے کہ انسانی ذات' ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہے اور زندگی کی تمام تگ وتاز کا ماحصل یہ ہے کہ یہ جزو اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی میں جا کر جذب اور فنا ہو جائے' یہ تصور قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا' خود اقبالؒ بھی اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کی تلقین یہ ہے کہ

چناں باذاتِ حق خلوت گزینی ترا اُو بینود اُو را تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحر نورش
(گلشنِ راز جدید)

یہ بہرحال' ایک الگ موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مومن وہ ہے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کے مقامات کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر زمیں سے تابہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمن[1] ابدی نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آ گہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

(ارمغانِ حجاز)

☆ ..... ☆ ..... ☆

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا' قرآنِ کریم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس میں مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں سے' مردانِ مومن کی خصوصیات کیفیات کا تذکرہ ہے اور علامہ اقبالؒ کا پیغام بھی چونکہ حقائقِ قرآنی ہی کا ترجمان ہے اس لئے اس میں بھی مومن کی صفات وتجلیات کو پہلو بدل بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ پھول کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح فرداً فرداً سامنے آتی ہیں اور کہیں انہیں گلدستہ کی طرح جامع حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میں ایسے مقامات کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی ایک جھلک بیک نظر آپ کے سامنے آ جائے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف' مثنوی اسرار و رموز میں سورۂ اخلاص کی آیت **وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ** کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رشتۂ با لم یکن باید قوی تا تود ر اقوامِ بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است ولا شریک بندہ اش ہم درنسازد باشریک
مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او بر نتاید ہمسرے
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر امر و نہیِ او عیارِ خیرو شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم
سازِ اُو در بزمہا خاطر نواز سوزِ اُو در رزمہا آہن گداز
زیر گردوں می نیاساید دلش بر فلک گیرد قرار آب و گلش

میں یہ اشعار پڑھ رہا ہوں اور میرے حافظہ میں ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے جو ہے تو ذاتی لیکن جی نہیں چاہتا کہ میں اسے یہاں بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ میرے ابتدائی تعلیم وتربیت' میرے لائقِ صد احترام' دادا جان (مرحوم ومغفور) کے زیرِ سایۂ عاطفت ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت علامہ کی یہ مثنوی مجھے خود پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ انہوں نے جب اقبالؒ کے اشعار اور قرآن کی روشنی میں' مردِ مومن کی صفات وخصائص بیان کیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں نے نہایت استعجاب اور کچھ خوف کے سے' ملے جلے جذبات کے ساتھ ان سے کہا کہ بابا جان! مردِ مومن اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے تو آج ساری دنیا میں کوئی مردِ مومن نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آج مردِ مومن کہیں نظر نہیں آتا لیکن

---

1. ذاتِ خداوندی میں فنا ہو کر نہیں' بلکہ اسی حریم میں' اس سے الگ۔

غنیمت ہے کہ اگر ہمارے دَور میں کوئی مومن نہیں تو دنیا میں آج کوئی کافر بھی موجود نہیں۔ اگر صورت یہ ہوتی کہ ابوجہلؓ تو ہوتا اور عمرؓ نہ ہوتا تو پھر البتہ گھبرانے کی بات تھی۔ دنیا آج کفر اور ایمان دونوں کی طرف سے بے اعتنا (INDIFFERENT) ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ زندگی کے حقائق کی طرف سے (INDIFFERENT) ہوجائیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا جو کچھ دادا جان (مرحوم) نے فرمایا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد جب ضربِ کلیم سامنے آئی تو اس کے شروع میں ہی یہ شعر نظر پڑا۔

نہ دیر میں، نہ حرم میں، خودی کی بیداری — کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روحِ تریا کی

تو میری سمجھ میں آیا کہ دادا جانؒ نے اتنا عرصہ پہلے کیا بات کہی تھی۔

یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں کلامِ اقبالؒ سے مردِ مومن کی صفات و خصوصیات کی مثالیں پیش کررہا تھا۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق اسکی محبت بھی عمیق — قہر بھی اسکا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں — ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو — شمع محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں — بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا — اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

میں ابھی ابھی عرض کرچکا ہوں کہ جب اقبالؒ کے کلام سے مردِ مومنؔ کی خصوصیات میرے سامنے آئیں تو میں نے بصد تاسف کہا کہ دادا جان! مجھے اس بھری دنیا میں کوئی مومن نظر نہیں آتا۔ اب سوچئے کہ جب کلام اقبالؒ کے سامنے آنے سے میری یہ کیفیت ہوگئی تھی تو اس باب میں خود اقبالؒ کی کیفیت کیا ہوگی؟ اقبالؒ ساری عمر مردِ مومن کی تلاش کرتا رہا اور گلی گلی، کوچہ کوچہ، صحرا صحرا، دریا دریا پکارتا گیا کہ:۔

ور معرکہ بے سوزِ تو، ذوقے نتواں یافت — اے بندۂ مومن! تو کجائی؟ تو کجائی؟

اس کی ساری عمر اسی پکار میں گذر گئی۔ لیکن زندگی بھر کی طلب و جستجو کے باوجود جب اسے مردِ مومن کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی تو وہ ہار تھک کر بیٹھ گیا اور انتہائی کرب و الم کے ساتھ پکار اٹھا کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ اس لئے کہ

منزل و مقصودِ قرآں دیگراست — رسم و آئینِ مسلماں دیگراست

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دین حق از کافری رسواتر است زانکہ ملا مومنِ کافر گراست

لہٰذا، مردانِ مومن کہاں سے آئیں؟

والسلام

☆ ..... ☆ ..... ☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورہ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

مذہبی پیشوائیت
احبار و رُہبان

آخری قسط

قرنِ اوّل میں:۔ اسلام کے قرنِ اول میں، جب دین اپنی حقیقی شکل میں قائم تھا، اسلامی حکومت اس فریضہ کو انجام دیتی تھی۔ اور چونکہ یہ حکومت ساری امت کی صحیح نمائندہ ہوتی تھی اس لئے درحقیقت خود امت اس فریضہ کو سرانجام دیتی تھی۔ نہ اس کے لئے کوئی الگ جماعت تھی اور نہ ہی غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے (تبلیغ) کے لئے کوئی خاص گروہ۔ یہ فریضہ بھی ہر مسلمان سرانجام دیتا تھا اور اس کے لئے اس کے پاس، سب سے زیادہ موثر ذریعہ خود اس کی سیرت و کردار تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ اس کا حسنِ معاملہ، اس کے دین کی صداقت کی محکم دلیل اور زندہ شہادت تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس زمانے میں امت میں کوئی گروہ ایسا نہیں تھا جس کے ذمے ''امور مذہبی'' کی سرانجام دہی ہو۔ اُس وقت امت ''مذہب'' کے لفظ تک سے آشنا نہیں تھی۔ ان کے پاس ''دین'' تھا۔ جس میں مذہبی اور سیاسی امور کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔

مذہب و سیاست کی ثنویت:۔ اس کے بعد جب ہمارے ہاں (دین کا نظام گم ہو جانے سے) مذہب اور سیاست کی ثنویت عمل میں آئی تو امورِ مملکت، حکمران طبقہ نے اپنی تحویل میں لے لئے اور ''مذہبی امور'' کے لئے ایک الگ گروہ وجود میں آ گیا۔ چونکہ ان کے پاس حکومت کا اقتدار نہیں تھا، اس لئے ان کے نزدیک ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے، اچھے کام کرنے کی تلقین کی جائے اور برے کاموں سے بچنے کی تاکید۔ اس طرح ایک طرف حکومت ایک خاص طبقہ کی ملکیت بن گئی اور دوسری طرف ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا واعظانہ فریضہ بھی ایک خاص گروہ کے اندر محدود ہو گیا۔ امت نہ اُس میں شریک رہی، نہ اس میں۔ ایوانِ حکومت میں ''حکمران طبقہ'' اپنے آپ کو ''ہم'' اور امت کو ''تم'' کہہ کر پکارتا تھا۔ اور مسجد میں

واعظ اور خطیب یہی کچھ کرتا تھا۔یعنی امت الگ تھی اور یہ دونوں گروہ الگ اور امت سے بالا۔یہی کیفیت آج تک چلی آرہی ہے کیونکہ اس کے بعد دین کا نظام (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) پھر قائم نہیں ہوا۔

ایک الگ گروہ:۔ یہاں تک بات بالکل واضح اور صاف ہے۔لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ایک الگ گروہ کے جواز بلکہ وجوب کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے سند پیش کی جاتی ہے۔وہ سورہ آل عمران کی حسب ذیل آیت ہے:۔ **وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** (3:104)۔اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:۔''اور چاہیئے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت رہے جو نیک کاموں کی طرف بلاتی رہے،اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے۔یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔''

(اور وہ گروہ علماء یا مذہبی پیشواؤں کا ہے۔۔۔اگر آیت (3:104) کا وہ مفہوم لیا جائے جس کے سہارے مذہبی پیشوائیت نے اپنے وجود کی سند مہیا کی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان تمام آیات کو منسوخ قرار دے دیا جائے گا،جن میں اسے پوری کی پوری اُمت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔اگر انہیں منسوخ نہ سمجھا جائے تو پھر قرآن کریم میں تضاد لازم آئے گا۔یہ کھلا ہوا تضاد ہے جو خود قرآن کریم کے دعویٰ کے خلاف ہے (4:82) اور جس سے قرآن مجید کی محکمیت ختم ہو جاتی ہے۔طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۹ء۔ص ۱۳)۔

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں کوئی اختلافی بات نہیں۔اس حقیقت کو اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بتایا ہے۔آپ ان تمام آیات پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری کی پوری امت کا فریضہ بتایا گیا ہے (اور جنہیں پہلے درج کیا گیا ہے)۔اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر اس آیت (3:104) کا یہی مطلب لیا جائے (کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں بلکہ امت کے ایک خاص گروہ کا ہے) تو اس سے بڑی اختلافی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟۔یعنی ایک طرف تو قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے اور ایک آیت میں یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں،امت کے ایک خاص گروہ کا ہے۔قرآن کریم کے دیگر مقامات کو چھوڑیئے،اسی سورہ آل عمران کے اسی رکوع میں،جس میں آیت (3:104) آئی ہے،پانچ آیتوں کے بعد وہ آیت موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (3:110)۔''تم بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔'' کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم پہلے یہ حکم دیتا ہو کہ تم میں ایک گروہ ایسا رہنا چاہیئے جو امر بالمعروف اور عن المنکر کرے۔اور پھر پانچ ہی آیات بعد یہ کہے کہ نہیں! یہ فریضہ تم میں سے کسی ایک گروہ کا نہیں،ساری کی ساری امت کا ہے۔اور پھر متعدد مقامات پر اس دوسری آیت کی تائید کرتا جائے۔یہ ہو نہیں سکتا۔پہلی آیت (3:104) کا مطلب،دیگر آیات کے مطابق ہی ہونا چاہیئے اور ان کے مطابق ہی ہے۔

''مِن'':۔اس میں غلط فہمی ''منکم'' سے پیدا ہوتی ہے۔(من۔کُم) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''تم میں سے''۔اس کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ عربی زبان میں (من) ''میں سے'' کے معنوں میں بھی آتا ہے (اسے ''تبعیض'' کہتے ہیں۔یعنی کل میں سے بعض)۔جیسے قرآن کریم میں ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (2:253)۔

یہ وہ رسول ہیں جنہیں ہم نے بعض سے بعض پر فضیلت دی ہے۔ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔یعنی ان میں سے بعض کی یہ خصوصیت تھی۔یہ تبعیض کی مثال ہے۔لیکن یہی ''من'' پوری کی پوری جنس کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔(اسے ''تبعین'' کہتے ہیں۔دیکھئے لغات القرآن۔باب ''من'')۔جیسے سورہء بقرہ میں ہے۔ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ (2:231) اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ نے کتاب وحکمت ''میں سے جو نازل کیا ہے''۔اس کے معنی ''کتاب وحکمت'' ہیں۔علامہ سیوطیؒ نے (الاتقان میں) اس کی اور مثالیں بھی دی ہیں۔مثلاً۔ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (18:31)۔اس کے معنی ''سونے کے کڑے'' ہیں۔علاوہ بریں آیت (ولتکن منکم امۃ۔۔۔) کے آخر میں ہے۔ واولئک ھم المفلحون۔''اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' اگر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے فریضہ کو ایک الگ گروہ کے ساتھ مختص کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی رو سے یہ خاص گروہ ہی فلاح پائے گا۔باقی امت نہیں۔یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔قرآن کریم نے فلاح وسعادت کی راہ کو تمام مومنین کے لئے کھلا رکھا ہے، نہ کہ ان میں سے کسی خاص جماعت کے لئے۔فلاح وسعادت کو ایک خاص گروہ کے اندر محدود کر دینے کا تصور تو اسلامی تعلیم کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔اس سے بھی واضح ہے کہ آیت (ولتکن مِنکم امۃ۔۔۔) سے مراد تمام جماعتِ مومنین ہے، اس میں کا کوئی الگ گروہ نہیں۔جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔''امور مذہبی اور تبلیغِ اسلام'' کے لئے ایک الگ مخصوص گروہ کا تصور اُس وقت پیدا ہوا جب سیاست کو دین سے الگ کر لیا گیا۔یعنی جب مملکت (Secular) ہوگئی۔اور ہر سیکولر اسٹیٹ میں امور مذہبی کے لئے الگ شعبہ (Ecclesiastical department) ہوتا ہے۔اسلامی مملکت میں پوری کی پوری مملکت ''امور مذہبی'' کے لئے وقف ہوتی ہے۔یعنی مملکت کا تمام کاروبار، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتا ہے۔اس لئے وہ دینی ہو جاتا ہے۔جب تک کسی مملکت میں ''امور مذہبی'' کے لئے ایک الگ گروہ مخصوص رہے گا، وہ مملکت سیکولر رہے گی۔

مذہبی پیشوائیت کی ضرورت نہیں:۔تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے:۔(۱)۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر، پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے، امت میں سے کسی الگ گروہ کا نہیں۔(۲)۔امت، اس فریضہ کو اپنی حکومت کے ذریعے سر انجام دیتی ہے۔ان کی یہ حکومت اس انداز کی ہوتی ہے جس میں ہر فردِ امت، بالواسطہ یا بلا واسطہ شریک ہوتا ہے۔اور اس کا سارا کاروبار قرآنی حدود کے اندر سرانجام پاتا ہے۔(۳)۔لہٰذا، اسلامی مملکت میں ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے لئے بھی مذہبی پیشوائیت کی ضرورت نہیں۔''

مِنکُم :۔ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۸ء ص۔۷۔ ''سوال یہ ہے کہ ان حضرات نے یہ مفہوم لے کس طرح لیا، جو قرآن کریم کی پوری تعلیم کے خلاف ہے؟۔ آیت کے الفاظ ہیں۔ ''ولتکن منکم امۃ''۔ انہوں نے ''منکم'' سے فائدہ اٹھایا اور اس کا مفہوم یہ لیا کہ ''تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے''۔ عربی زبان کا مبتدی بھی یہ جانتا ہے کہ کہ حرف ''مِن'' کے متعدد معانی میں سے دو معانی نمایاں ہیں۔ یعنی تبعیض اور تبیین۔ تبعیض کے معنی ہوتے ہیں۔ ''میں سے۔'' اور ''تبیین'' سے مراد ہوتی ہے۔ ''پورے کا پورا۔'' عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرف ''من'' کو ''تبعیض'' (میں سے) کے معنوں میں صرف اُس مقام پر لینا چاہیئے جہاں اس کی جگہ لفظ ''بعض'' کو بلا تکلف لا سکیں۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنیٰ ''تبیین'' کے لینے چاہئیں (یعنی پورے کا پورا)۔ حوالہ کے لئے دیکھئے (۔۔ اتقان)۔ جب قرآن مجید کی دیگر تمام آیات میں یہ فریضہ پوری کی پوری اُمت کا قرار دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی روشنی میں آیت (3:103) میں حرف ''من'' کے معنیٰ ''بعض'' لینے کا کوئی قرینہ ہی نہیں۔ اس کے معنیٰ ''پوری کی پوری اُمت'' لئے جائیں گے۔ قرآن مجید کی بکثرت آیات میں حرف ''مِن'' کے یہی معنیٰ لئے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسلمہ ہے جس کے لئے کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے محض اپنے وجود کے اثبات کے لئے اس کے ایسے معنیٰ لئے ہیں۔ جو خود اس قاعدے کے بھی خلاف ہیں اور قرآن مجید کی پوری کی پوری تعلیم کے بھی خلاف۔ اُس زمانے میں کسی ذہن کی اُپج نے یہ اختراع کی اور اس کے بعد اس آیت کے یہی معنیٰ کئے چلے جاتے ہیں کیونکہ اس سے (بزعمِ خویش) مذہبی پیشوائیت کے وجود کی سند مل جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ اس سے ان کے وجود کی سند مل جاتی ہے بلکہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے معنی وعظ و نصیحت کئے جاتے ہیں۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت خواہ کفار ہی کی کیوں نہ ہو، وعظ و نصیحت کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہء خداوندی ادا ہو جاتا ہے۔ اس سے دین کی ساری عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ (اس مقام پر مثال کے طور پر صرف دو آیات پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ (ا)۔ سورۃ التغابن میں ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2)۔ ''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تم میں سے بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن۔'' ظاہر ہے کہ یہاں ''من'' کے معنیٰ ''تبعیض'' ہی کے لئے جائیں گے۔ دوسری طرف سورہء فاطر میں ہے: وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ (35:31)۔۔ ''اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی جو حق پر مبنی ہے۔'' اگر یہاں ''من'' کے معنیٰ ''بعض'' لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے کتاب کا صرف کچھ حصہ رسول پر نازل کیا۔ اس مفہوم کی رو سے اسلام کی اصل و اساس پر پانی پھر جاتا ہے۔ لہٰذا، اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہاری طرف پوری کی پوری کتاب نازل کی۔ اس میں ''منکم'' کے یہی معنے ہیں اور یہی معنی آیت (3:103) میں لئے جائیں گے کیونکہ سارے قرآن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا قرار دیا گیا ہے نہ کہ امت میں سے کسی ایک گروہ کا۔ اس سے واضح ہے کہ اس آیت کی وہ تاویل جو یہ حضرات کرتے ہیں منشاء و مقصودِ قرآنی کے یکسر خلاف ہے۔ بحوالہ۔ طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۹ء۔ ص۔۱۴۔۱۳)۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء اسی دلیل کے سہارے یہ کہا کرتے تھے کہ جب ہندوستان کی جمہوری حکومت ہمیں تبلیغِ اسلام یعنی وعظ و نصیحت کی اجازت اور ضمانت دیتی ہے تو اس سے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے؟۔۔۔ اب یہ حضرات یہاں بھی اسی تصور کا اسلام رائج کرنا چاہتے ہیں، جس میں سیاسی امور تو اقتدارِ حکومت کی رو سے سرانجام پائیں اور تبلیغِ دین۔۔ یعنی اُن کے تصور کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کا فریضہ مختلف جماعتیں سرانجام دیں۔۔یعنی ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق۔۔اس ضمن ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔آیت (3:104) کے آخر میں کہا گیا ہے:۔ **أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** ۔ یعنی یہ لوگ فلاح یافتہ ہیں۔قرآن مجید میں مومنین کو ''مفلحون''، یعنی فلاح یافتہ کہا گیا ہے۔ان حضرات نے اس آیت کا یہ مفہوم لے کر کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر علماء کا فریضہ ہے، یہ بھی ثابت کر دیا کہ ''مفلحون'' یہی حضرات ہیں، باقی اُمت فلاح یافتہ نہیں۔

صرف ایک جماعت کا جواز:۔اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔(اگر ان حضرات کی اس تاویل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔اس آیت میں کہا گیا ہے کہ: ولتکن منکم امۃ''۔''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو یہ فریضہ ادا کرے۔اس سے (ان حضرات کی تاویل کی رو سے بھی) امت میں اس قسم کی صرف ایک جماعت کے وجود کا جواز نکل سکتا ہے۔ایک سے زیادہ کا نہیں۔لیکن امت میں اس فریضہ کی ادائیگی کے مدعی جس قدر فرقے اور جماعتیں ہیں ان کا حد وشمار ہی نہیں۔سوال یہ ہے کہ اس قدر کثیر تعداد کے گروہ اپنے جواز کے لئے اس آیت سے کس طرح سند لیتے ہیں؟۔اس کا طریق بڑا آسان ہے۔ان میں سے ہر گروہ کا دعویٰ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والی جماعت ہم ہیں۔باقی تمام فرقے اور جماعتیں اپنے دعوے میں جھوٹی ہیں۔بحوالہ طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۹ء۔ص۔۱۴)۔جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری کی پوری اُمت کا فریضہ قرار دیں گے تو اس میں فرقہ بندی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی۔لیکن جب آپ اسے امت میں سے ایک گروہ کا فریضہ قرار دے دیں گے تو پھر امت میں مختلف گروہ پیدا ہو جائیں گے۔جن میں سے ہر ایک اس کا دعویٰ کرے گا کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں وہی حق پر ہے۔باقی سب باطل پر ہیں۔یہ جو امت میں فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے وہ اسی قسم کے تصورات کا نتیجہ ہے۔قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے پہلے ہی اس سے متنبہ کر دیا تھا۔چنانچہ آیت (3:104) سے پہلی آیت میں بھی کہہ دیا کہ:۔ولا تفرقوا۔''تم تفرقہ نہ پیدا کر لینا۔''اور اس کے بعد کی آیت میں بھی کہہ دیا کہ:۔ **وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ** (3:105)۔اور دیکھو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے ''بیّنٰت'' (وحیء خداوندی) کے آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔اور اس طرح وہ بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔یاد رکھئے! جو نظامِ خداوندی حضور اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا تھا، اس میں:۔(۱) مملکت کے آئین وقوانین کا سرچشمہ قرآن مجید تھا۔(۲)۔امت، امتِ واحدہ تھی اور فرقہ بندی شرک۔(۳)۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ مملکت سرانجام دیتی تھی، جس میں تمام امت شریک تھی۔اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں تھا۔جب اور جہاں اس شکل کا نظام قائم ہوگا، اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔باقی سب فریبِ نفس!۔''

حکم دینے کی اتھارٹی:۔یہ امر قابلِ غور ہے کہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا واضح مطلب ہے ''نیکی کا۔حکم۔دینا اور برائی سے منع کرنا''۔ظاہر ہے کہ ''حکم'' دینے کا اختیار کسی فردِ واحد، کسی گروہ یا کسی جماعت کو حاصل نہیں ہو سکتا۔یہ اختیار قرآنی حکومت کا

ہے۔ جو جماعت، حکومت سے ہٹ کر آیت نمبر 3:104 کے تحت قائم کی جاتی ہے وہ حکم دینے کا اختیار ہی نہیں رکھتی۔ ایسی الگ جماعت یا جماعتوں اور گروہوں وغیرہ کی دین میں نہ اجازت ہے، نہ کوئی حیثیت۔ (موءلف)۔

☆.....☆.....☆

فتویٰ جاری کرنے کی اتھارٹی:۔ ہمارے مذہبی راہنماؤں کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ ہر اُس شخص کو جو اُن سے اختلاف کرے ''کافر، مرتد اور واجب القتل'' قرار دے دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے تمام فرقے اور مذہبی جماعتیں ایک دوسرے کو کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دے چکے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کی نظر میں مسلمان نہیں ہیں۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت دوسروں کی جانب سے جاری کئے گئے اپنے خلاف فتویٰ کو صحیح ماننے پر تیار نہیں۔ ہر جماعت خود کو صحیح اور باقیوں کو غلط سمجھتی ہے۔ اور اسی خوش فہمی میں مگن ہے (30:31-32)۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے فتاویٰ کی کوئی حیثیت نہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت نے (فرقوں اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ) کس کے خلاف فتویٰ نہیں دیا؟۔ سرسید احمد خان، علامہ اقبال، قائدِاعظم، مولانا مودودی، غلام احمد پرویز، ذوالفقار علی بھٹو، جاوید احمد غامدی وغیرہ۔ جن کے خلاف فتویٰ جاری کیا گیا، اُن کا تو کچھ نہیں بگڑا، البتہ فتویٰ دینے والوں کے نام تک کا بھی کسی کو علم نہیں۔ سوائے چند جذباتی لوگوں کے، ان فتووں کو کس نے مانا؟۔ فتویٰ فروشوں کو خود ہی اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ اُن کے فتاویٰ کا یہ حشر کیوں ہوتا ہے؟۔

فتووں کا حشر:۔ فتویٰ کے اس حشر کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت فتویٰ جاری کرنے کا اختیار از خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اپنی متوازی حکومت قائم کر کے حکومت کو اس معاملے میں بے اختیار کر دیتی ہے۔ فتویٰ جاری کرنے کا اختیار مذہبی پیشوائیت، کسی فردِ واحد، کسی گروہ، کسی جماعت یا فرقے کو حاصل نہیں ہے۔ آج، تکفیر کا جو اختیار مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہے، وہ اسے حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ قانون سازی کا یہ اختیار ایسی حکومت کا ہے جو قرآن کریم کے مطابق قائم ہوئی ہو۔ ویسے بھی حکومت (خواہ وہ غیر اسلامی ہی کیوں نہ ہو) ہی کے پاس اختیارِ قانون سازی اور قوتِ نافذہ ہوتی ہے۔ جس کے فیصلوں پر عمل ممکن ہوتا ہے۔ قادیانیت کے خلاف فتووں، قانون سازی اور اس پر عمل درآمد کی تاریخی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب تک حکومت (جو کہ مسلمانوں کی تھی مگر اسلامی نہیں تھی) نے اسمبلی سے قانون سازی نہ کرالی، مخالفینِ ختم نبوت عملاً غیر مسلم قرار نہ پا سکے۔ فتویٰ (قانون سازی) اسلامی حکومت (سنٹرل اتھارٹی) کی طرف سے جاری ہونا چاہیئے نہ کہ نجی طور پر یا نجی اداروں کی طرف سے۔ کیونکہ جب ریاست (اسلامی ہو یا غیر اسامی) کے اندر، حکومت کے علاوہ، کسی اور فرد یا گروہ کے حقِ قانون سازی (فتویٰ دینے کے اختیار) کو تسلیم کر لیا جاتا ہے تو وہ افراد یا گروہ اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے بھی از خود اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

فتویٰ جاری کرنے کا اختیار، دہشت گردی کا سبب:۔ (دورِ عباسیہ میں) علم و عمل کی مرکزیت کے خاتمے اور دین کی

دنیا (سیاست) سے علیحدگی کے بعد مذہبی راہنماؤں نے اپنے طور پر فتاویٰ جاری کرنے کا کام سنبھال لیا۔ مسلم حکومتوں نے بھی اُن مذہبی پیشواؤں سے فتاویٰ لینے شروع کر دیئے۔ اُسی زمانے سے، مذہبی پیشوائیت نے اپنے اپنے فرقوں کے دارالافتاء قائم کر رکھے ہیں جو اپنی محدود فرقہ پرستانہ سوچ کے تحت کفر وارتداد اور وجوب القتل کے فتوے جاری کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح مذہبی جذبات کو ہوا دے کر اپنے مخالف کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔ جس کے خلاف فتویٰ جاری کیا جاتا ہے اُسے اکثر اوقات مرتد قرار دے کر واجب القتل قرار دے دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ سوائے دہشت گردی کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ جذباتی لوگ واجب القتل شخص کو ٹھکانے لگا کر اپنی دانست میں جنت کے حقدار بن جاتے ہیں۔

اداروں میں نمائندگی:۔ پاکستان کا آئین سیکولر ہے۔ اس میں ''برکت'' کے لئے چند ''اسلامی'' شقوں کا پیوند لگا کر اسے ''اسلامی آئین'' کا نام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئین کی ''اسلامی شقوں'' کے تحت کچھ ادارے (اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شریعت کورٹ، رویتِ ہلال کمیٹی وغیرہ) قائم کئے گئے ہیں۔ ان اداروں میں مختلف فرقوں کے مدارس کے فارغ التحصیل ''علماء'' کو نمائندگی دی جاتی ہے۔ باقی عالم فاضل لوگوں کو ان اداروں کی رکنیت کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ تمام یونیورسٹیوں اور کالجز میں صدیوں سے عربی اور اسلامیات کے پورے پورے (Full-fledged) ڈیپارٹمنٹس (شعبہ جات) موجود ہیں جہاں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ (پی۔ایچ۔ڈی ڈاکٹرز، پروفیسرز) حضرات کو بھی آئینی مذہبی اداروں میں نمائندگی دی جاسکتی ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت اپنے علاوہ کسی دوسرے کو نہ اس قابل سمجھتی ہے، نہ برداشت کرتی ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت خود بھی سیکولر ہوتی ہے اور ریاست کو بھی سیکولر (دین کو دنیا سے الگ) رکھنا چاہتی ہے تاکہ اُسے سیکولر حکومت کے متوازی (افتاء جیسے) قانون سازی کے اختیارات حاصل رہیں اور اُس کا متوازی اقتدار برقرار رہے اور یوں اُس کی اہمیت اور اُس کا وجود برقرار رہے۔ بصورت دیگر اُس کی ضرورت ختم ہو جائے گی، اُس کا وجود مٹ جائے گا اور یہ امر اُس کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ ہم نے اور ہمارے آئین نے مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری (Monopoly) کو تسلیم کر رکھا ہے۔ اگر قرآنی حکومت قائم ہو جائے تو نہ الگ طور پر ان اداروں کی، اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کی ضرورت رہے گی (موءلف)۔

☆.....☆.....☆

اجنبی پودا:۔ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۸ء۔ صفحہ نمبر ۳۔ ''مذہبی پیشوائیت، اسلام کی سرزمین میں ''اجنبی پودا'' ہے۔ اسلامی نظام میں اس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ آپ عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ پر نگاہ ڈالئے، اس میں کہیں مذہبی پیشواؤں کا وجود نظر نہیں آئے گا۔ قرآن مجید نے یہ کہہ کر اس طبقہ کی ضلالت آمیزیوں اور تباہ کاریوں سے متنبہ کر دیا تھا کہ:۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ** (9:34)۔ ''یعنی علماء و مشائخ کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مال نا

حق طریق پر کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' آیت کے آخری الفاظ گہری توجہ کے محتاج ہیں۔ ساری دنیا یہ سمجھتی ہے، (اور علماء و مشائخ اس کا دعویٰ کرتے ہیں) کہ یہ لوگ خدا کی طرف جانے والے راستے کی راہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس راستے کی طرف راہنمائی کرنا تو ایک طرف، اس راستے میں سب سے بڑی روک خود ان کا وجود ہے۔ بناء بریں، اگر ہمیں، عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں ان کا وجود نظر نہیں آتا تو یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ قرآن کریم نے اس سے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر اس طبقہ نے معاشرہ میں راہ پالی تو اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ وجہ ہے جو ہمیں اُس دور میں، مذہبی پیشواؤں کا الگ وجود تو ایک طرف، مولوی ابو ہریرہؓ یا مولانا ابنِ عباسؓ جیسے الفاظ تک نہیں ملتے۔ امت میں اس طبقہ کا وجود اُس وقت پیدا ہوا جب اسلامی نظام باقی نہ رہا اور خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ اسی سے دین اور سیاست میں ثنویت (جدائیگی) پیدا ہوئی۔ سلاطین اور مذہبی پیشواؤں میں سمجھوتہ ہوا۔ سیاسی امور، سلاطین نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور مذہبی امور، مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں دے دیئے۔ اس طرح مملکت میں دو اقتدار متوازی قائم ہو گئے۔ امورِ مملکت سے متعلق قوانین میں حرفِ آخر بادشاہوں کا قرار پایا۔

متوازی اقتدار:۔ اور قوانینِ شریعت میں قولِ فیصل، مذہبی پیشوائیت کا۔ یہ بہت بڑا مقام تھا جو مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہو گیا۔ یہ سلسلہ صدیوں سے برابر چلا آ رہا ہے۔ اُمت میں نہ دوبارہ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہوئی، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہوا۔ علاّمہ اقبالؒ نے اسلامی مملکتِ پاکستان کا جو تصور دیا تھا اس سے اُن کی مراد، خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دوبارہ قیام تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے قیام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، مذہبی پیشوا ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے ان کے خلاف جہاد، اپنا اوّلیں فریضہ سمجھا اور اسے عمر بھر جاری رکھا۔ آپ کلامِ اقبالؒ کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں سب سے زیادہ اور شدید ترین مخالفت مُلّا کی ہے۔ اس سے کوئی خاص مُلّا، یا مُلّاؤں کا کوئی خاص طبقہ مراد نہیں تھا۔ اس سے اُن کی مراد مذہبی پیشوائیت (Priesthood) کا ادارہ (Institution) تھا۔ جو اسلامی مملکت (یا اسلامی نظام) کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ملوکیت، ملائیت اور پیریت کو مسلمانوں کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے تھے۔ اُن کے اس قسم کے سینکڑوں اشعار اس حقیقت پر دال ہیں کہ:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

تحریکِ پاکستان کی سب سے شدید مخالفت اسی طبقہ کی طرف سے ہوئی۔ کیونکہ یہ جانتے تھے کہ اگر اقبالؒ کے تصور کی اسلامی مملکت قائم ہو گئی تو اس سے ان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد، ان کی مسلسل کوشش ہے کہ اس میں اسلامی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ یہ بات نظر بظاہر خلافِ حقیقت (Paradoxical) (اور مبنی بر تعصب) دکھائی دے گی لیکن امر واقعہ یہی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی ثبوت یا شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ سب سے بڑی شہادت خود خدا کی ہمارے پاس موجود ہے جس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ علماء و مشائخ کا وجود خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی روک ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس

آیت (9:35) میں احبار ورھبان سے مراد کسی خاص مذہب یا خاص قوم کے علماء ومشائخ نہیں۔اس سے مراد ''مذہبی پیشوائیت'' ہے خواہ وہ کسی مذہب یا قوم کی ہو۔تاریخِ عالم اس پر شاہد ہے کہ دنیا میں نظام خداوندی (دین) کے قیام کی سب سے بڑی مخالفت اسی طبقہ کی طرف سے ہوئی ہے۔''

طلوعِ اسلام:۔مئی ۱۹۸۴ء۔ص۔۵۸۔''نکتہ ءشرعِ مبیں یہ تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔لیکن مذہبی پیشوائیت نے قرآنِ حکیم کے اس اصل الاصول کو اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ یہ سرتا پا حرکت وحرارت قوم، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔یہ سب دین فروش ہیں۔قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ ان کا شیوہ یہ ہے کہ:۔ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ وہ ارشاداتِ خداوندی ہیں۔یہ سب کچھ اس لئے کہ:۔ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ تاکہ اس سے چار پیسے کمائے جائیں۔اور نہیں جانتے کہ:۔ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (2:79)۔ ان کے یہ فتاویٰ اور ان کے ذریعے حاصل کردہ روٹی انہیں لے ڈوبے گی۔اس سے:۔ع:۔

عقل و نقل افتاد در بندِ ہوس منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس

(یہ منقولی بات کہیں یا معقولی، مقصد ان کا اپنی مفاد پرستی ہوتا ہے۔ان کا منبر روٹی بیچنے والے کا خوانچہ بن کر رہ گیا ہے۔)

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود آستیں ہا بے یدِ بیضا، چہ سود؟

یہ وہ صاحبانِ ضربِ کلیم نہیں، جن کا شعبانِ مبین، فرعون، ہامان وقارون کو ہڑپ کر جائے۔ان کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں میں ایمان کی شمعیں نہیں۔لہٰذا، ان سے کشودِ کار کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔''

فکر کی کوئی بات نہیں:۔طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۸ء۔ص۔۳۶۔''لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔زمانے کے تقاضے از خود مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کو توڑتے چلے جا رہے ہیں۔جب یہ دیگر مذاہب میں نہیں رہیں، تو مسلمانوں میں کس طرح رہ سکیں گی۔باطل کے لئے تو مٹنا مقدر ہے۔مسلکِ پیشوائیت مٹے گا اور دنیا اس نظام کی طرف آئے گی جس نے انسانی آزادی کا منشور عطا کیا تھا۔جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

موت کا پیغام، ہر نوعِ غلامی، کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے، امیں

اس سے بڑھ کر، اور کیا فکر وعمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

☆.....☆.....☆

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

آخری قسط

تخلیق کی نورافشانی

Glow of Creation

اپریل 1965ء میں نیویارک کا موسم خوشگوار تھا۔ اسی مہینہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ''رن آف کچھ'' میں چپقلش کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہی دنوں پنزیاس نے اپنے مسئلے کے حل کے لئے نیویارک میں موجود مشہور ریڈیو ماہر فلکیات برنی برک کو فون کیا۔ لیکن ابتداء میں ہی ایک اور مسئلہ بات چیت کا موضوع بن گیا۔ پنزیاس شاید اپنی مشکل کا ذکر ہی نہ کرتا لیکن برک کے پوچھنے پر کہ کرافورڈ کا تجربہ کیسا جارہا ہے پنزیاس نے اس گمنام 'سوں سوں' کی آواز کا تذکرہ کیا۔ برک کو یہ شکایت سن کر ایک حیرت انگیز جھٹکا سا محسوس ہوا کیونکہ وہ پیبلز کی زبانی سن چکا تھا کہ پرنسٹن میں ڈائیک کی ٹیم فائربال ریڈی ایشن کی تلاش میں مصروف ہے۔ برک نے پنزیاس کو پُرامید لہجے میں کہا کہ شاید

"Burk immediatly altered penzias to the possibility that the anomalous signal might be the left over glimmer of the big bang."

یہ سن کر پنزیاس کے دِل میں خوشی کے شادیانے بجنے شروع ہوگئے۔ تاہم برک نے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کیلے پنزیاس کو ڈائیک سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اور پنزیاس نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ "He got on the phone to dike."۔ یہ وہی کال تھی جس کا تذکرہ گذشتہ قسط میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اس کال کو سنتے ہی ڈائیک نے کہہ دیا تھا۔ ''دوستو ہم دیکھتے ہی رہ گئے اور بازی کوئی اور لے گیا۔'' اس کال کے دوسرے دن ڈائیک، رول اور ولکنسن بیل لیب میں انٹینے کے معائنہ کے لئے آئے۔ پنزیاس اور ولسن نے انہیں کرافورڈ ہل میں گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ وہ پہلے ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے مگر پنزیاس، ڈائیک کے نام سے آگاہ تھا اور ولسن کے دل میں بھی ڈائیک کا بڑا احترام تھا۔

"I was cnsiderably in awe of him, says wilsion,he was the grand old man of microwaves."

واقعی آج یہاں اعلیٰ درجے کے ماہرین فلکیات کا اجتماع تھا۔ باہمی تعارف کے بعد پنزیاس اور ولسن نے مہمانوں کو اپنے آلات دکھائے۔ ڈائیک کی ٹیم نے وہ پراسرار آواز بھی سنی۔ انہیں بھی جلد احساس ہوگیا کہ پنزیاس اور ولسن اعلیٰ درجے کے ماہرین

فلکیات ہیں۔ چند سوالات و جوابات کے بعد ڈائیک نے تصدیق کر دی کہ یہ وہی چیز ہے جسکی تلاش میں وہ تھے۔ یقیناً یہ ایک اہم دریافت تھی جو اتفاقیہ طور پر (By accident) سامنے آئی۔ مارکس کہتے ہیں کہ

"If they were right,it was the most important discovery in cosmology since Edwin Hublle had found that the universe was expanding back in 1929. Permeating every pore of the universe was a tiped radiation, the afterglow of the titanic fire ball in which the universe was born.

مارکس نے ان دو فون کالوں کی روداد 'A tale of two telephone calls' کے عنوان کے تحت بیان کی ہے انہوں نے ان کالوں کو بڑی اہمیت بھی دی ہے وہ کہتے ہیں:۔

"it is a fair claim that one of greatest scientific discoveries of 20th century was made by telephone. Infect not by one telephone call but by two".

مارکس کے مطابق بیک گراونڈ ریڈی ایشن کا ٹمپریچر اور ابتدائی کائنات کا درجہ حرارت ایک ہی تھا۔ کائنات میں جاری پھیلاؤ سے کائنات کے ٹمپریچر میں کمی ہونے کے ساتھ ساتھ کا سمک ریڈی ایشن میں بھی کمی آتی گئی۔ جس کے نتیجے میں کائنات اور مائیکرو ویو دونوں کا موجود درجہ حرارت $270.42^{\circ}c$- یعنی مطلق زیرو سے صرف تین درجے اوپر ہے۔ کائنات میں یقیناً بے شمار انتہائی گرم ستارے موجود ہیں لیکن اگر ان کی حرارت کا تناسب یا تقابل اتنی بڑی وسیع کائنات سے کیا جائے تو ان ستاروں کی مجموعی حرارت مکمل طور پر ناقابل ذکر اہمیت کی حامل ہوگی۔ بیک گراونڈ ریڈی ایشن بگ بینگ وقوعہ کے تقریباً تین لاکھ سال بعد جب مادہ سے آزاد ہوئی تو کائنات کا درجہ حرارت تین ہزار ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ اس ٹمپریچر میں ایٹم بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت تیزی سے ٹھنڈا ہوتا ہوا Fire ball' روشن ہو گیا۔ فوٹانز (photons) جو فائر بال کی دُھند (fog) میں ذرات سے اچھل کود (bouncing) کر رہے تھے اچانک آزادانہ نقل و حرکت کے قابل ہو گئے اور

"They have been doing so eversince. Gradually losing energy as the universe has grown in size".

کائنات کا ٹمپریچر ہزار ڈگری تک گر جانے سے ایک اور اہم واقعہ کی نشاندھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ وہ نقطہ ہے جب کائنات میں ریڈی ایشن توانائی کی کثافت (Energy density of radiation.) یا فوٹانز مادے کے مقابلے میں زوال پذیر ہو گئی اور اس کے بعد کائنات میں مادے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشش ثقل کی حکمرانی شروع ہو گئی۔

سٹیفن ہاکنگ سمیت تقریباً تمام سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ مائیکرو ویو ریڈی ایشن کی دریافت نے نظریہ بگ بینگ کی

تصدیق کردی ہے۔ مارکس کے الفاظ میں:

"The detection of the cosmic radiation by Penzias and Wilson meant that the big bang theory was tramphate. If Martin Rayle's work at Cambridge on glaxies had sent the steady state theory veeling, the discovery of the after glow of creation delt it a knock-out blow.

1950اور 1960ء کے عشروں میں مارٹن رائیل نے کیمبرج میں بیرونی مکان سے آنے والی ریڈیائی لہروں کے منبعوں (Sources) کے سروے کے بعد چند ایسی پیشین گوئیاں کی تھیں جن سے سٹڈی سٹیٹ نظریے کی کمزوریاں سامنے آئی تھیں۔ بقول اسٹیفن مارٹن رائیل کی ہر تشریح سٹڈی سٹیٹ کے نظریے کی پیشین گوئیوں سے متضاد تھی۔

"Either explanation contradicted the predictions of the steady state theory".

ہولمڈل (Holmdel) میں بیل لیب کے سائنسدانوں نے اس دریافت سے پہلے 1931ء میں بھی ایک بڑی اہم سائنسی دریافت (great scientific discovery) کی تھی، جب بیل لیبارٹریز کے ایک چھبیس سالہ نوجوان سائنسدان کارل جنسکی نے ریڈیو interference کے منبعوں (sources) پر تحقیق کے دوران

"Detucted a weak static that seemed to be coming from the milky way, and thus invented the science of radio astronomy".

جن دنوں یہ اہم دریافت سامنے آئی، انہی دنوں ولسن کے والد ٹیکساس سے یہاں اپنے بیٹے کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ پنزیاس کی مشہور کال کے دوسرے دن وہ سویرے سویرے نزدیکی ڈرگ سٹور پر گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھ میں نیویارک ٹائمز کی کاپی تھی جو انہوں نے اپنے بیٹے کے آگے پھینکی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر بیس فٹ انٹینے کی تصویر کے ساتھ اس دریافت کی تفصیل تھی۔ ولسن کہتا ہے کہ "I realy got the impression the world was taking this thing seriously". دریافت کے بعد پرنسٹن اور بیل لیب والوں نے اس پر الگ الگ سائنسی مقالے بھی لکھے جو 'Astro physical journal letter' میں ایک ساتھ شائع ہوئے۔ ہل برائسن نے بھی اس دریافت پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''جس آواز کو پنزیاس اور ولسن سن رہے تھے یہ وہی آواز تھی جس کی پیش گوئی گیمو نے کی تھی۔ انہوں نے کائنات کے کنارے تک یا کم از کم اس کے نظر آنے والے حصے تک رسائی حاصل کرلی تھی جو کہ اربوں کھربوں میل کی دوری پر واقع تھا۔ وہ فوٹانز کا مشاہدہ کررہے تھے جو کائنات کی قدیم ترین روشنی تھی۔ اس نور کو اگرچہ وقت اور فاصلے نے مائیکرو ویوز میں تبدیل کرلیا تھا جیسے گیمو نے عندیہ ظاہر کیا تھا۔ ایلن گوتھ اپنی کتاب "Inflationary univers". میں ایک مماثلت کا ذکر کرتا ہے جس کی رو سے گیمو کے

نظریے کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر آپ کائنات کی گہرائی میں جھانکنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ایمپائر اسٹیٹ کی سوویں منزل پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھیں (سوویں منزل سے مراد آج کا دور ہے اور سٹرک بگ بینگ کے وقوعہ کے وقت کو ظاہر کرتی ہے) یعنی جس وقت پنز یاس اور ولسن نے دور ترین کہکشاؤں کا مشاہدہ کیا تو وہ 60ویں منزل پر تھے اور دور ترین اشیاء یعنی کوا سرز (Quassars) بیسویں منزل پر تھے۔ پنز یاس اور ولسن کی بدولت ہم آشکارا کائنات سے اتنا ہی قریب ہو گئے جیسے کہ فٹ پاتھ سے تقریباً آدھا انچ دور ہوں''۔ (A short history of nearly every Thing)

بل برائسن نے دونوں ٹیموں کی طرف سے لکھے گئے سائنسی مقالوں کا بھی ذکر ہے جن کا اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اس کے فوری بعد اسٹروفزیکل جرنل نے دو مضامین شائع کئے۔ ایک مضمون کے مصنف پنز یاس اور ولسن تھے جنہوں نے اس 'سی سی' کے بارے میں لکھا تھا۔ دوسرا مضمون ڈائیک اور اس کی ٹیم نے لکھا جس میں انہوں نے اس صدا کی حقیقت کا تجربہ کیا تھا۔ اگرچہ پنز یاس اور ولسن کائناتی پس منظر کی نور افشانی یا ریڈی ایشن کی ٹوہ میں نہیں تھے نہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ اور جب انہیں یہ عجیب وغریب آواز سنائی دی تو اس کے بارے میں انہوں نے نہ تو کوئی بیان جاری کیا اور نہ ہی کوئی مضمون لکھا اس کے باوجود انہیں 1978ء میں فزکس کے نوبل پرائز سے نوازا گیا اور پرنسٹن کے سائنسدانوں کو صرف شاباش ملی۔ ڈینس اوور بائی اپنی کتاب 'Lonely hearts of cosmose' میں لکھتا ہے کہ پنز یاس اور ولسن کو اس دریافت کی اہمیت کا اس وقت تک اندازہ ہی نہیں تھا جب تک انہوں نے نیویارک ٹائمز میں نہ پڑھا''

انہوں نے کاسمک مائیکرو ویوز بیک گراونڈ ریڈی ایشن کا تعارف یوں بیان کیا ہے۔ ''کائناتی پس منظر ریڈی ایشن کی ہلچل ایک ایسا وقوعہ ہے جس کا ہم سب کو تجربہ ہے۔ آپ اپنے ٹیلی ویژن کو کسی ایسے چینل پر ٹیون کریں، جہاں کوئی پروگرام نہ چل رہا ہو۔ اور سکرین پر آپ کو حرکت کرتے ہوئے کالے رنگ کے دھبے اور لائنیں دکھائی دیتی ہیں ان میں سے تقریباً ایک فیصد بگ بینگ کی باقیات ہیں۔ اگلی دفعہ جب آپ یہ شکایت کرنے لگیں کہ فلاں چینل پر تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تو فوری طور پر اس خیال سے اپنے دل کو تقویت دے لیں کہ آپ کائنات کی پیدائش کا عمل دیکھ رہے ہیں'' اس کے علاوہ ہمارے ہاں عام مائیکرو ویوز اوونوں (ovens) میں بھی یہی ریڈی ایشن استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ نے بھی مائیکرو ویو کی دریافت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں وہ 1965ء میں دو امریکی ماہرین طبعیات آرنو پنز یاس اور رابرٹ ولسن نیو جرسی کی بیل ٹیلی فون لیبارٹریز میں نہایت حساس مائیکرو ویو سراغ رساں (Microwave detector) کی آزمائش کر رہے تھے۔ مائیکرو ویو یا خرد موجیں، روشنی کی لہروں کی طرح ہی ہوتی ہیں مگر ان کا تعدد (Frequency) دس ارب یا دس ہزار ملین لہریں (Waves) فی سیکنڈ ہوتا ہے۔ پنز یاس اور ولسن نے جب دیکھا کہ ان کا سراغ رساں کچھ زیادہ ہی شور وصول کر رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔'' آگے انہوں نے وہی واقعات لکھے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس پوری پیش رفت میں بدقسمتی سے گیمو اور

اس کی ٹیم کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا جو انتہائی ناانصافی کی بات ہے۔ گیمو نے ہی اس ریڈی ایشن کی پیش گوئی کی تھی اور تقریباً دس سال تک اس کے بارے میں تحقیق کرتا رہا مضامین لکھے کتابیں شائع کیں۔ الفر اور ہرمین نے بھی مقالے شائع کئے۔ مختصر یہ کہ مائیکرو ویو پر ابتدائی کام اس کی ٹیم نے کیا مگر اس ریڈی ایشن کی دریافت پر جو دو مقالات لکھے گئے ان میں گیمو پارٹی کا نام تک نہیں لیا گیا جس پر گیمو نہ صرف سخت ناراض ہوا بلکہ سخت احتجاج بھی کیا۔ ڈائیک کی ٹیم کو اس غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے اس کی وضاحت بھی کرنے کی کوشش کی۔

کائناتی پس منظر ریڈی ایشن کی مزید تصدیق 1968ء میں اس وقت ہوگئی جب پرنسٹن میں ڈائیک ٹیم کے اینٹینے نے بھی یہ سگنل وصول کرنا شروع کر دیا۔ اسی سال گیمو کا انتقال ہوگیا۔ اس کی وفات کے دس سال بعد پنزیاس اور ولسن کو طبیعات کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس میں بھی زیادتی یہ ہوئی کہ ڈائیک اور اس کی ٹیم کو نظر انداز کیا گیا۔ کاسمک مائیکرو ویو ریڈی ایشن کی دریافت میں ابتدا سے مختلف سائنسی حلقے ایک اہم سوال کی طرف اشارا کرتے آئے ہیں کہ بیسویں صدیں کی ایک انتہائی اہم دریافت اتفاقیہ اور غیر متوقع طور پر کیوں ہوئی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کی دریافت کیلئے پہلے سے باقاعدہ منظّم منصوبہ بندی کیوں نہ ہوسکی۔ دیگر سائنسدانوں کی طرح نوبل پرائز یافتہ ماہر طبعیات 'Steven Wienburg' کے ذہن میں بھی یہ سوال قلبلا رہا تھا۔ انہوں نے اس سوال پر غور وفکر کرنے کے بعد اس غفلت کی تین وجوہات بتائی ہیں جو انہوں نے بگ بینگ پر لکھی گئی اپنی اہم اور معروف کتاب 'The first three mitues.' میں بیان کی ہیں۔ سٹیون پہلی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جس تھیوری کی بنیاد پر گیمو نے یہ پیشین گوئی کی تھی بعد میں مزید تحقیق کے بعد مسترد (Discredited) کر دی گئی تھی۔ اس تھیوری کے مطابق گیمو کا موقف تھا کہ بگ بینگ میں ہی تقریباً تمام عناصر وجود میں آ چکے تھے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بہت سے عناصر (Element) بعد میں بنے۔ اب چونکہ یہ تھیوری مسترد ہوگئی تو اس پر مبنی پیش گوئی کی طرف کسی نے سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ دوسری وجہ سٹیون یہ بتاتے ہیں کہ بگ بینگ ریڈی ایشن کی ابتدائی پیش گوئی کرنے والے تھیورسٹس (Theorists) کو ریڈیو ماہرین فلکیات (Radio Astronomer) نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس ریڈی ایشن کا قطعاً سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس وجہ سے بھی یہ لوگ مایوس ہوگئے تھے۔ آخری اور سب سے اہم وجہ خود سٹیون سے سنیے:

"Before 1965 extra-ordinarily difficult for any physicist to really take seriously any theory of early universe. It was failure of imagination again. The temperature and density of matter in the first few minuts of the universe would be so far removed from everyday experience that it was hard for anyone to really believe that they had actually hapened".

کائناتی پس منظر مائیکرو ویو ریڈی ایشن کی زمین پر دریافت کے بعد بگ بینگ، کائناتی اور مائیکرو ویو کے درجہ حرارت، اس کی پیمائش، مائیکرو ویو سپیکٹرم کی پیمائش، بگ بینگ ریڈی ایشن کی ہمواریت (smoothness) وغیرہ پر تحقیق و تجربات کے لئے نئے نئے آلات اور نئی ٹیکنالوجی ایجاد ہونے لگی جس کے نتیجے میں 1970ء کی دہائی میں نئی قسم کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی سامنے آ گئی۔ بگ بینگ نظریے کا پہلا بڑا ٹیسٹ (Test) اس وقت کامیاب ہو گیا تھا جب ولکنسن اور رول نے پرنسٹن میں آسمان کے درجہ حرارت کی 3.2 سینٹی میٹر ویولینتھ (Wavelenght) پر کامیابی سے پیمائش کی تھی اور معلوم کر لیا تھا کہ اس کا درجہ حرارت مطلق زیرو سے تقریباً تین درجہ حرارت اوپر ہے۔ مائیکرو ویو سے منسلک سائنسدانوں میں سے ایک ماہر طبعیات نے مائیکرو ویو کی پیمائش کو بہت ہی سادہ قرار دیا ہے۔ پارٹرج (Partridge) کہتے ہیں:

"The experiments to measure the radiation are simple to understand and simple to describe. The radiation itself is simple-it is a black body and has the same temperature in all directioins in the sky. Once you have said those two things about it,you have said every thing there is to say. The simplicity of the cosmic background radiation is telling us some thing marvellous-The early universe was a remarkably uncomplicated place.

1970ء کی دہائی میں ولکنسن نے ایک نئی ٹیکنالوجی ایجاد کی۔ یہ تھی فضا میں بہت ہی بلندی پر اڑنے والے بیلون (balloons) کی ٹیکنالوجی۔ یہ بیلونز فضا میں انتہائی بلندی (ایورسٹ سے تین یا چار گنا زیادہ بلندی) پر آلات لے جا سکتے تھے۔ اتنی بلندی پر ہوا کی تہہ اتنی پتلی (Thin) ہوتی ہے کہ یوں سمجھئے کہ یہ آلات خلا میں ہیں جہاں پر اس ریڈی ایشن کی پیمائش آسانی سے ہو سکتی ہے۔

تمام شعاعوں کی پیمائش زمین سے زیادہ خلا میں آسان ہوتی ہے۔ اور اسکے نتائج بھی زیادہ درست ہوتے ہیں۔ اس لئے زمین پر مائیکرو ویو کی دریافت کے بعد 1970ء کی دہائی میں مختلف سائنسی حلقوں سے تجاویز سامنے آنے لگیں کہ اب اس کا فضا میں بھی مشاہدہ کیا جائے۔ اِدھر اُدھر سے یہ تجاویز آتی رہیں مگر اس کے لئے باقاعدہ منظّم کوشش کا آغاز 1974ء میں اس وقت ہوا جب نیویارک کے 'Goddard space science center' میں جان مارتھر کی قیادت میں سات ماہرین طبعیات اکٹھے ہوئے۔

They were proposing nothing less than a quest for the holly grail of cosmology.

اس اجلاس میں پرنسٹن کے ولکنسن بھی موجود تھے۔ یہ اپنی پوری زندگی مائیکرو ویو سے منسلک رہے۔ پہلے زمین پھر خلا میں انہوں

نے کاسمک ریڈی ایشن کی وضاحت میں بے شمار اور اہم خدمات سرانجام دیں۔اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ناسا (NASA) سے خلا میں کاسمک ریڈی ایشن کے مشاہدے کے لئے ایک مواصلاتی سیارہ تیار کرنے کی درخواست کی جائے۔اس درخواست میں کچھ تجربات کی تجاویز بھی دی گئی تھیں۔مقصد اِن تجربات کا یہ تھا:۔

"The experiments would include one to measure the specturm of the big bang radiation better than anyone had ever dreamed and another to scan the whole microwave sky, searching for the tiniest departure from absolute smoothness".

ناسا (The National Aeronautics and space Administration) ان دنوں اپنی مختلف سائنسی کمیٹیوں کی طرف سے اور باہر کی کئی سائنسی ٹیموں کی جانب سے آئی ہوئی سینکڑوں تجاویز کے طوفان میں گھرا ہوا تھا۔باہر کی ٹیموں میں جان ماتھر کی ٹیم کے علاوہ دو اور اہم ٹیمیں تھی۔ناسا کے لئے ان حریف ٹیموں میں سے کسی ایک کا انتخاب خاصا مشکل کام تھا۔تاہم انتظامیہ نے ذہانت اور حکمت سے کام لیتے ہوئے ان تینوں ٹیموں کے سربراہوں پر مشتمل ایک سٹڈی ٹیم کی تشکیل سے اس مشکل کا حل نکال لیا۔اس کے بعد ناسا والوں نے سٹڈی ٹیم کے مشورے سے مواصلاتی سیارے کی تیاری کیلئے قابل عمل رپورٹ (Feasibility studies) مرتب کرنے کے علاوہ دیگر ابتدائی تیاریوں کا آغاز کر دیا۔زیادہ تر کام جان ماتھر کی ٹیم کی طرف سے دی گئی تجاویز کے مطابق ہو رہا تھا۔سٹڈی ٹیم میں ماتھر، گُل کیس اور جارج سموٹ شامل تھے۔ان ابتدائی رپورٹوں اور دیگر تیاریوں کی تکمیل کے بعد آخر کار ناسا نے 1982ء میں ٹیم کو سٹلائٹ بنانے کیلئے ہری جھنڈی دکھا دی۔سیارے کا نام کوبی (cosmic background explorer) رکھا گیا اور اس پر ساٹھ ملین امریکی ڈالرز کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا۔اسے سات سال بعد 1989ء میں خلا کی طرف روانہ ہونا تھا۔ابتدائی پروگرام کے تحت کوبی (COBE) کو ڈیلٹا راکٹ لانچر کے ذریعے مدار تک پہنچانا تھا لیکن بعد میں ناسا نے فیصلہ تبدیل کر کے ٹیم کو ہدایت کی کہ کوبی کو ڈیلٹا راکٹ کے مطابق ڈیزائن کرنے کی بجائے سپیس شٹل کے مطابق ڈیزائن کرے کیونکہ اب کوبی کو سپیس شٹل کے ذریعے مدار تک پہنچایا جائے گا۔ٹیم کے لئے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا مگر انہوں نے سب دشواریوں پر قابو پا کر کام جاری رکھا۔1986ء تک کوبی کی تیاریاں آخری مرحلے میں تھیں کہ 28 جنوری کو سپیس شٹل بدقسمتی سے آسمان میں پرواز کے دوران حادثے کا شکار ہو گیا۔اس میں سوار ساتوں خلانورد ہلاک ہو گئے۔اس افسوس ناک حادثے کے بعد کوبی سمیت ناسا کے تمام خلائی پروگرام تعطل کا شکار ہو گئے۔خلائی سائنسدان کے لئے یہ انتہائی مایوسی کے دن تھے لیکن جلد ہی امریکی حکومت نے حالات پر کنٹرول کر کے صورت حال کو بڑی خوبی سے بحال کر دیا۔لیکن کوبی ٹیم کو ایک اور سخت مرحلے کا سامنا تھا۔وہ یہ کہ حادثے کے بعد ناسا نے فیصلہ کیا کہ اب کوبی کو سپیس شٹل کے ذریعے نہیں بلکہ اسی ڈیلٹا راکٹ کے ذریعے پولر مدار تک بھیجا جائے

گا۔اب کوبی ٹیم کو سیٹلائٹ کے ڈیزائن میں کافی بنیادی تبدیلیاں کرنی تھیں ۔مارکس نے اس ستم ظریف صورتحال کو یوں بیان کیا ہے۔

But finally they came back to thier original choice – the trusty delta rocket. It was ironic. After originally designing cobe for a delta launch then redesigning it for launch by the shuttle. The team began redesigning it for a delta once again. It was enough to make any despair.

کوبی نے دن رات ایک کر کے دو سال کے تھوڑے عرصے میں سیٹلائٹ کو ڈیلٹا راکٹ کے مطابق تیار کر لیا۔کوبی میں استعمال ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی احتیاط سے معائنہ کیا جاتا۔یہاں تک کہ پرزوں پر گلو (Glue) لگاتے وقت بھی باقاعدہ ماہرین کی میٹنگ ہوتی اور دیکھا جاتا کہ اس پرزے پر کون سا گلو لگایا جائے۔ٹیم کے ایک اعلیٰ انجینئر بینٹ (Bennett) کا کہنا ہے کہ میں اس دو گھنٹے کی میٹنگ کو نہیں بھول سکتا جس میں:۔

We were discussing a bolt – a single bolt. How long should it be? How many turns per inch? What way should it turn.

خلائی سیارے کو خلا میں چھوڑنے (Launching) سے پہلے کئی ایک آزمائشوں اور تجربات کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔کوبی کو بھی ان آزمائشی مراحل سے گزرنا تھا۔پہلے اس کے اوزاروں (Instruments) کا ٹیسٹ لیا گیا۔یہ بھی چیک کیا گیا کہ پُرزے ایک دوسرے سے رگڑ تو نہیں کھاتے۔اس کے بعد 'shake test' میں پورے سیارے کو زور زور سے ہلایا گیا۔پھر تھرمل ٹیسٹ لیا گیا۔بڑی محنت اور لگن سے تیار کیا گیا کوبی "COBE eventually passed all of its test with no problems". اس کی تیاری میں پچاس ماہرین کے علاوہ دیگر سینکڑوں لوگوں نے حصہ لیا۔انجینئروں میں ماتھر، ولکنسن، بینٹ، جارج سموٹ اور رائٹ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔کوبی کے انجینئروں خصوصاً ماتھر اور بینٹ نے اپنے آپ کو اس اہم مہم کے لئے وقف (Dedicate) کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ایک دن:۔

"Finally, after two and a half years of non stop activity every thing was ready. COBE had taken a mamoth 1600 person-year to build and cost total of $ 60 million".

کوبی کی روانگی 28 نومبر 1989ء مقرر کر دی گئی ۔بینٹ نے اس روانگی کے حالات و واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ روانگی سے ایک رات قبل ٹیم کے اکثر ممبر لاس انجیلز کے شمال میں ایک سو میل دور وینڈن برگ (venden

(burg ائیر فورس بیس (Base) پر پہنچ گئے تھے۔ روانگی والی رات کو ہمیں لگ بھگ تین بجے جگایا گیا اور ہم بس پر سوار ہو کر روانگی کی جگہ پہنچے۔ بہت سخت سردی تھی۔ بس نے جب انہیں روانگی کے مقام سے ایک میل پیچھے اتارا تو ابھی تک سحر ہونے میں کافی دیر تھی۔ فیلڈ میں کافی ہجوم تھا اور لوگ بڑے پُر جوش نظر آ رہے تھے۔ ولکنسن بڑے جذباتی دیکھائی دے رہے تھے۔ ہجوم کو اس وقت خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے گیموٹیم کے الفراور ہرمن کو ایک کونے میں کھڑے دیکھا۔ گیموا گر زندہ ہوتا تو ناراضی کے باوجود یہاں موجود ہوتا۔ ماتھر نے انہیں دور سے دیکھ کر اشارے سے خوش آمدید کہا۔ اسی نے ان کو مدعو بھی کیا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا لوگوں کے اضطراب اور خدشات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بینٹ سوچ رہا تھا کہ عام طور پر تو ڈیلٹا راکٹ کامیاب رہے ہیں لیکن پھر بھی "There were so many things that could go wrong". خاص کر 600 لیٹر مائع ہیلیم کی موجودگی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال جب

"Dawn was breaking when an extra-ordinarily bright light flared low on the clear sky. Bennet drew in a sharp breath. He had expected to hear a loud sound first. 'my first thought was, oh no, it's blown up!' but every thing was fine".

دھماکہ ہوا اور ایک چوندھیا دینے والی روشنی ثابت قدمی سے آسمان کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں موجود ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ یہ سب کچھ اتفاقیہ، اچانک یا خود بخود نہیں ہو گیا تھا۔ یہ انسان کی پندرہ سالہ شعوری کوشش کا نتیجہ تھا۔ "After fifteen years effort, COBE was at last on its way, That was beautiful sight". بینٹ راکٹ کے خلا میں اوجھل ہو جانے کے بعد وہاں رکا نہیں۔ He says, I was responsible for getting the smoothness experement turned on and checked out".

وہ سفر کے دوران ریڈیو پر خبریں سنتا رہا کہ کوبی کیسے پرواز کر رہا ہے۔ "The radio reported a successful launch" کوبی اب اپنے مدار تک پہنچ چکا تھا جو زمین سے 900 کلومیٹر بلند تھا۔ کوبی زمین کے گرد ایک دن میں چودہ چکر لگا رہا تھا۔ ''COBE awakened,opening its eyes to the microwave universe.

کوبی کی پرواز کے تقریباً سات ہفتے کے بعد ورجینیا میں ایک میٹنگ کے دوران ماتھر نے ہزاروں لوگوں کے سامنے کوبی کے تجربات کا نتیجہ بیان کیا اور وہ تھا:۔

A specturm of the microwave background based on just nine minuts of looking at the sky. Here is our specturm,he said. The little boxes are the

points we measured and here is black body curve through them. As you can see, all our points are curve".

وہ یہ سب کچھ ایک پروجیکٹر پر ناظرین کو دکھا رہا تھا۔ بینٹ کا کہنا ہے کہ پہلے تو مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر اِدھر اُدھر سرگوشیاں شروع ہوگئیں اور پھر لوگوں نے کھڑے ہو کر پُر جوش انداز میں تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ دراصل کوبی نے سپیکٹرم کی شعاعوں کا مشاہدہ بہت پہلے کر لیا تھا لیکن کوبی ٹیم نے مزید اطمینان کی خاطر سے خفیہ رکھا تھا۔ مائیکرو ویو کے سپیکٹرم کی پیائش کے بعد کوبی نے پورے آسمان کا سروے کر کے مختلف تجربات کئے اور

"The differential microwave radio meter completed it first detaild map of the entire sky in dec, 1991. Each its horns had made a staggerieng 70 million measurements. Differential microwave radio meter was so sensitive that it could detect a differenc in temperature of only 0.00001 of a degree.

ازاں بعد کوبی ٹیم سیٹلائٹ سے موصول ہونے والی اطلاعات پر تجربات اور ہزاروں اقسام کی پیائشوں میں مصروف رہی۔ اس کی طرف سے کوئی اعلان وغیرہ سامنے نہ آنے کی وجہ سے لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ کوبی نے کوئی ایسی دریافت کر لی ہے جس سے نظریہ بگ بینگ کی نفی ہوتی ہے اس لئے ٹیم خاموش ہوگئی ہے۔ تاہم ٹیم تمام مواد (Data) اکٹھا کرتی رہی اور جب اسے ہر پہلو سے اطمینان ہوگیا تو اس نے حتمی اعلان کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ

1- COBE had find the seeds of galaxies.

2-The COBE team had at last found evidence of lump (مادے کے ڈھیر) in the early universe.

اور بقول مارکس یہ بھی کہ

"But by April 1992, the COBE team was as sure as it ever would be That some thing was lurking in the data, it was time to make an announcement.

اس اعلان کے لیے ایک پریس ریلیز مرتب کی گئی جس پر کچھ دن بحث ومباحثہ جاری رہا۔ ٹیم نے یہ فیصلہ کیا کہ پریس ریلیز کے ساتھ ایک فوٹو گراف بھی جاری کر دیا جائے۔ اس فوٹو گراف میں:۔

"It was the one showing the whole sky, with mauve patches showing bits of the sky that seemed to be hotter than average and blue showing colder

patches".

اس اعلان کے لئے 24، اپریل 1992ء کا دن مقرر کیا گیا۔ اس دن امریکن فزیکل سوسائٹی کے بڑے ہال میں بہت زیادہ رش تھا۔ تاریخ ساز اعلان جارج سموٹ نے کرنا تھا۔ سموٹ (smoot) نے بیس منٹ میں اپنی دریافت کا تعارف کرادیا۔

"He presented the result and tried to give the people some idea of what it meants".

ہال میں سے کسی نے سوال کیا کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔ جواب میں سموٹ نے کہا۔

"Well, if you are a religious person it is like seeing the face of God".

سموٹ کا یہ آخری جملہ بعد میں نہ صرف سائنسی حلقوں میں بلکہ پریس اور عام لوگوں کے درمیان بحث ومباحثے کا موضوع بن گیا۔ سائنس اور مذہب کے باہمی تعلق پر بحثیں شروع ہوگئیں۔ یقیناً ان بحثوں کا تعلق مائیکرو ویو یا کوبی سے نہیں تھا۔ نہ ہی سموٹ کے ذہن میں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی مگر کچھ اخبارات نے اسے حقیقی انداز سے لیا اور اپنے قارئین کو مخصوص تاثر دینے کی کوشش کی کہ

"Giving their readers the distinct impression that in the depths of space the COBE scientists had realy found traces of God".

اسٹیفن ہاکنگ نے بھی مائیکرو ویو ریڈی ایشن کی دریافت کو بیسویں صدی کی سب سے بڑی دریافت قرار دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'The universe in netshell' میں متذکرہ بالا فوٹو گراف بھی دیا ہے اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔ ''کاسمک بیک گراؤنڈ ایکسپلورر (COBE) سیٹلائٹ 1989ء میں چھوڑا گیا جس نے مائیکرو ویوز میں آسمان کا نقشہ تیار کیا ہے۔ مختلف رنگ مختلف درجہ ہائے حرارت کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن سُرخ رنگ سے نیلے رنگ کی جانب ساری رینج ایک ڈگری کا تقریباً دس ہزارواں حصہ ہی ہے۔ تاہم مختلف خطوں کے درمیان یہ تغیر ابتدائی کائنات میں اس لیئے کافی ہے کہ زیادہ کثیف خطوں میں اضافی تجاذبی کشش (Extra gravitational attraction) انجام کار انہیں پھیلنے سے روک دے اور انہیں دوبارہ اپنی تجاذبی قوت کے تحت منہدم (Collapse) کردے تاکہ وہ کہکشائیں اور ستارے تشکیل دے سکیں۔ چنانچہ کم از کم اصولی طور پر COBE کا نقشہ تمام ساختوں (Structures) کے لئے بلیو پرنٹ (Blue Print) ہے''۔

☆.....☆.....☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

آصف جلیل

الهداية والعرفان فی تفسير القرآن بالقرآن

محمد ابو زيد

مندرجہ بالا تفسیر آج سے تقریباً ۸۳ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس کو تحریر میں لانے والے محمد ابوزید صاحب الازہر کے علماء میں سے تھے۔ لیکن جب ان کی یہ تفسیر چھپ کر آئی تو ان کے قریبی ساتھی علماء بھی ان کے شدید مخالف ہو گئے۔ اس وقت کی حکومت مصر نے اس پر پابندی عائد کر دی اور اسے ضبط کر لیا۔ کئی سال قبل میرے ایک کرم فرما نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی تلاش کروں۔ کہا جاتا تھا کہ الازہر کی لائبریری میں اس کی ایک کاپی موجود ہے۔ انٹرنیٹ کے عام ہونے کے بعد جب میں نے تلاش شروع کی تو کتاب تو نہ ملی البتہ اس پر لکھے گئے تبصرے پڑھنے کو ملے جو ظاہر ہے اسی طرح کے تھے کہ اس کتاب کا پڑھنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ اسے لکھنے والا سنت کا انکار کرتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل پھر اس کتاب کے لئے کچھ اور احباب نے تقاضہ کیا تو پھر سے تلاش شروع کی۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ فیس بک نے ساری دنیا کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔ میں نے فیس بک پر اہل عرب سے متعدد بار درخواست کی کہ وہ اس کتاب کو حاصل کرنے میں میری مدد کریں۔ آخر کار مصر کے ایک شہری نے جو صرف قرآن کو ماننے والا تھا مجھے وہ جگہ بتائی جہاں اس کو سکین کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ جو شے کمپیوٹر کی دنیا میں آ جائے وہ پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔

میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے لیکن مجھے یہ کہیں سے بھی تفسیر کی کتاب نہیں لگی۔ کیونکہ اس میں آیات کی تشریح نہیں کی گئی۔ لیکن در اصل اس میں تصریف الآیات کے اصول کو اپناتے ہوئے ہر آیت کے ساتھ اس کے موضوع سے متعلق تمام آیات کا حوالہ دیا گیا ہے تا کہ قاری انہیں بھی پڑھ لے۔ بعض جگہوں پر الفاظ کے وہ معانی لکھے گئے ہیں جو قرآن کے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔

میں آپ کے لئے اس کتاب کا پیش لفظ ترجمہ کر کے پیش کر رہا ہوں۔ قارئین کے لئے یہ بات حیران کن ہو گی کہ محترم محمد ابوزید اور علامہ پرویز صاحب کے قرآن فہمی کے اصولوں میں کس قدر مماثلت ہے۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ قرآن کو کسی خارجی مواد کے بغیر سمجھا جائے تو سب ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں چاہے وہ کہیں بھی رہتے ہوں۔ افسوس ہے کہ روایت پرست طبقے نے امت کو قرآن سے کس قدر دور کر دیا ہے۔ انسانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی نظام ہو ہی نہیں سکتا جسے لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر کے محض چند رسوم ادا کرنے کا نام اسلام رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی قرآن کی ہی شہادت ہے کہ جو کوئی اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس کی شدت سے مخالفت ہوتی ہے۔ شکر ہے کہ علامہ پرویز کی کتابیں مخالفوں کی ہزار کوششوں کے باجود ضبط ہونے سے بچ گئیں اور اب کمپیوٹر پر

آنے والی ہر شے مذہبی پیشواؤں کی دسترس سے نکل گئی ہے۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ اہل عرب نے بھی خالص قرآن کی طرف آنا شروع کر دیا ہے۔ فیس بک پر متعدد افراد نے عربوں تک قرآن کی آواز پہنچانے کا عزم کر رکھا ہے۔

پیش لفظ کا ترجمہ

''میں نے مناسب سمجھا کہ میں القرآن کی تفسیر کا کام اپنی عمر کے چالیس سال مکمل ہونے کے بعد کروں اور اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے اس کام کے مقاصد کے حصول کی توفیق دے جو کہ لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے جس سے انکی اجتماعی زندگی میں دین کی خوبیاں عیاں ہو جائیں۔

لوگوں کو دین کی ضرورت

دین کے بغیر لوگ اپنے مفادات کا تعین نہیں کر سکتے اور اگر ایسا کر سکیں تو اس کے لئے انہیں بہت طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ وہ متفق نہیں ہو پاتے جس کی وجہ انکی اپنی خواہشات اور مقاصد ہوتے ہیں۔ دین ان کے مفادات کے تعین میں ان کا وقت بچاتا ہے اور ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور انہیں اس پر عمل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ اس سے علم اور ہدایت پاتے ہیں۔

رسولوں کی بعثت: تجدید اور تصدیق کرنے والے

یہ اللہ کا فضل رہا ہے کہ اس نے ہر قوم کے لئے رسول بھیجے۔ جب کوئی رسول وفات پا جاتا اور لوگ اس کی تعلیمات کو بھول جاتے یا ان میں نت نئی باتیں اور خرافات شامل کر دیتے تو ایک اور رسول آتا جو دین کی تجدید کرتا اور جو کچھ اس سے پہلے آنے والے انبیاء اور رسولوں سے ملا ہوتا اس کی تصدیق کرتا۔ (دیکھئے سورۃ النحل کی آیت ۳۶ اور سورۃ الاعراف)۔ اصل میں دین ایک ہی ہے جو اللہ کا دین ہے۔ اگر لوگ انصاف سے کام لیتے اور تعصب کو چھوڑ دیتے تو وہ سب اسی دین کی طرف لوٹ آتے اور جان لیتے کہ اللہ کے دین میں کسی قسم کا تضاد یا ٹکراؤ نہیں پایا جاتا۔

القرآن کتابوں کی تصدیق کرتا ہے

چونکہ القرآن اللہ کی کتابوں میں سے آخری کتاب ہے اس لئے لوگوں پر فرض ہے کہ وہ دین کی حقیقت جاننے کے لئے اس کی طرف رجوع کریں۔ القرآن ہی وہ کتاب ہے جس کی دوسری کتابوں کے برعکس حفاظت کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے ابدی رہنے دینا چاہتا ہے۔ سابقہ کتابیں ایسی قوموں کے زمانے میں آئی تھیں جو ابھی مکمل طور پر ذہنی پختگی کو نہیں پہنچی تھیں۔ اس وقت شریعت ان کی ذہنی سطح اور معاشرتی صورت حال کے مطابق تھی تآنکہ قوموں کی ذہنی بنیاد پختہ ہو گئی اور انکی اتنی استعداد ہو گئی تو القرآن مکمل شریعت کے ساتھ اور تمام سابقہ کتب کے اصولوں کے ساتھ آیا، انکی تصدیق کی اور ان کی طرف دعوت بھی دی۔ جو ان کتابوں پر ایمان لاتا ہے وہ اس پر بھی ایمان لاتا ہے۔

مسلمانوں کی حالت

کوئی یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ جب القرآن مکمل طور پر معاشرتی اصولوں کو لئے ہوئے آیا ہے تو مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہے کہ وہ پیچھے رہ گئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان القرآن سے دور ہٹ گئے اور انہوں نے اس کے مطابق عمل نہ کئے۔ ان میں سے ایک گروہ نے اس پر غور ہی نہیں کیا اور محض اس سے نسبت رکھنے کو کافی سمجھا۔ اور دوسرا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اسے تھامے ہوئے ہے لیکن دراصل اسے سمجھنے میں غلطی کرنے کی وجہ سے دور ہوگیا۔

تفاسیر

تفاسیر میں اس قدر ملاوٹ اور پیوندکاری کی گئی ہے کہ آپ کسی بھی قرآنی اصول کو دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایک روایت گھڑی ہوتی ہے جو اس کی بنیاد کو منہدم کرتی ہے اور اسے بدل دیتی ہے۔ مفسروں نے یہ سب کچھ اپنی کتابوں میں غیر محسوس طور پر شامل کردیا۔ انہوں نے اصطلاحات اور فقہی باتوں پر مبنی مذاہب کو قرآن فہمی کے اصول بنادیا اور انہیں اس پر مسلط کردیا حتی کہ وہ لڑائی کا میدان بن کر رہ گیا۔ اس پر اتنا بوجھ ڈالا گیا، اس کی راہ میں روکاوٹیں کھڑی کی گئیں اور فرقہ واریت اور دوریاں پیدا کی گئیں کہ وہ زندگی گزارنے کے قابل نہ رہا۔

اس کی ہدایت الفاظ کے معانی اور مذاہب (فرقوں) کے جھگڑوں کے درمیان گم ہوگئی۔ اس کے معنی اور مقاصد منسوخ کرنے والی روایات اور تفاسیر میں ضائع ہوگئے۔ کوئی بھی تفسیر ان سب سے خالی نہیں ہے کیونکہ مفسروں نے ایک دوسرے کی نقل کی ہے۔ نقل کرنے کی عادت اس حد تک پہنچ گئی کہ میں نے بعض مسائل کو پچاس لکھی ہوئی تفسیروں میں پڑھا لیکن مجھے کسی ایک میں کوئی ایسی بات نہ ملی جو دوسری میں نہ ہو۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ انکی بنیاد جھوٹی روایات یا مردہ رائے تھی جسے اللہ کے کلام کی تفسیر کہنا صحیح نہیں ہے۔

مفسروں نے لغت کی بعض کتابوں پر انحصار کیا جن میں الفاظ کے لفظی معانی دیئے گئے اور بعض نے صرف چند معانی کو لیا جس کی وجہ سے القرآن کے الفاظ کے معانی بدل گئے اور اس کے مقاصد میں تبدیلی آ گئی۔ اس طرح سے نقل کی عادت اور اصطلاحات دوسری کتابوں کے علاوہ ڈکشنریوں میں بھی اس طرح رائج ہوگئیں کہ القرآن کے بہت سے الفاظ کے معنی زبان کی لغت میں اسی طرح بیان ہوئے جس طرح کہ فقہ کی کتابوں میں بتائے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے زبان کے مفہوم سے بہت دور ہونے کی وجہ سے القرآن نے اس سے جو مراد لی تھی اس سے دور ہٹ گئے۔

میری تفسیر میں اختیار کردہ طریقہ

اسی وجہ سے مجھے اپنی تفسیر کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں میرا طریقہ کار یہ ہے کہ میں آیت اور الفاظ کے وہ معنی ظاہر کروں جو آیات اور سورتوں میں اس موضوع سے متعلق ہوں۔ اس طرح القرآن کے تمام موضوعات کا علم ہوجاتا ہے اور القرآن ہی اپنی وہ تفسیر

کرتا ہے جو اللہ نے بتائی ہے۔ جس کی تائید کائنات میں اللہ کی سنت اور معاشرے میں اس کے نظام سے ہوتی ہے۔

میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ القرآن کی تمام آیات کو لوں تا کہ ہدایت پانے کو وہی ترتیب رہے جسے اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اس طرح کہ آیت کے معنی تلاش کرنے والا اس کے سیاق وسباق کی آیات پڑھ لے تا کہ اسے مکمل ہدایت اور نصیحت کا علم ہو جائے۔

تفسیر کرنے کے اس طریقے سے کوئی شے القرآن سے آپ کی توجہ نہیں ہٹا سکے گی۔ ہم اس میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہوتے ہیں تا کہ اس کے موضوعات یکجا ہو سکیں اور اس کی آیات کے درمیان ہم آہنگی رہے۔ اس طرح آپ کا غور وتدبر اسی میں محصور رہے گا تا کہ اس کی معلومات سے آپکی عظمت ہو اور اس کی ہدایت سے آپ ہدایت پائیں۔

سنت

اسی طرح سنت رسول ﷺ یعنی القرآن کے بارے آپؐ کا طریقہ کار تھا اور یہی وہ حکمت ہے جس کا اللہ کے قول میں ذکر ہے (وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ البقرہ کی آیت ۱۵۱)۔ الکتاب سے مراد احکام سے متعلق مکمل قانون ہے۔ آپ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ الکتاب ایک دستور ہے جس میں تمام قوانین کے اصول دیئے گئے ہیں اور ہر زمانے کے قانون سازوں کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اسی سے رجوع کرنا ہوگا۔ (دیکھئے النحل کی آیت ۸۹)

سنت سے مراد الکتاب کو عملی طور پر نافذ کرنے کا طریقہ ہے۔ الرسول کا منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ الکتاب لوگوں تک پہنچائے اور ان کی ہدایت کے لئے اس پر عمل کر کے دکھائے۔ الرسول لوگوں کا امام ہوتا ہے جو جس راہ کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہوتا ہے اس میں عملی طور پر سب سے آگے ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی حکمت ہے کہ قوانین اور اصولوں کی کوئی قیمت نہیں رہتی اگر اس کے ماننے والے اور اس کی طرف دعوت دینے والے سب سے پہلے خود عمل کرنے والے نہ ہوں۔

اور اگر قانون وضع کرنے والا اس سے ماوراء ہو یعنی اس کے ذریعے لوگوں کا محاسبہ تو کرے مگر اپنا نہیں تو ایسے قانون کا کوئی خوف نہیں رہتا اور نہ ہی لوگوں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ (دیکھئے الاحزاب کی آیت ۴ اور ۲۱ اور الشوریٰ کے آخر میں)۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں

یہ ضروری ہے کہ ہر زمانے کے عالم امامت میں الرسول کے وارث ہوں۔ وہ جدید حالات کے مطابق قرآنی اصولوں پر عمل درآمد کے لئے محنت کریں تا کہ توحید کی وجہ سے امت کا غلبہ دائم رہے اور اس کا دین اور اس کے معاشرتی نظام کے ساتھ تعلق مضبوط ہو۔

اس طرح دین امت کی تقویت کا باعث بنتا ہے اور جس قدر ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے، اس کی حاجت ہوتی ہے اور اسے منفعت بخش پاتے ہیں اتنا ہی امت اس کی طرف آتی ہے۔

القرآن کی خوبیاں

۱۔ اسکا انداز بیان فصیح ہے جس سے انسان کی زبان اور قلم کو بنیاد ملتی ہے۔ اس سے وہ پیغام ملتا ہے جو وہ سننا چاہتا ہے۔

۲۔ معاشرتی احکام کے لئے اس میں امت کی جماعت کو مخاطب کیا گیا ہے جس کی وجہ سے امت کے اعمال میں یگانگت آتی ہے اور اس کی ذمہ داریاں ظاہر ہوتی ہیں اور حکمرانی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

۳۔ آیات کے آخر میں ان سے متعلق اللہ کی صفات کو لانا۔ جیسے علیم حکیم، عفو قدیر، شدید العقاب، غفور رحیم اور کل شیء عندہ بمقدار، تاکہ ذہنوں میں ان کے معانی راسخ ہو جائیں اور اللہ کی عظمت سامنے آئے اور اس کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہو۔ اس طرح انسان مخلوق اور نظام سے متعلق امور میں اپنے رب کی پیروی کرے۔

۴۔ عقل کو بہت زیادہ اہمیت دینا اور اسے احکام کو سمجھنے کے لئے اور معاملات کو چلانے کے لئے بنیاد قرار دینا۔

۵۔ اللہ کی توحید کے ذریعے لوگوں کے نفوس کو بلند کرنا اور مخلوق کی ذلت مٹانا۔

۶۔ عقائد کی آزادی دینا اور مذہبی حکمرانی کا خاتمہ کرنا تاکہ اپنی مرضی سے اللہ کے دین کے تابع ہوں نہ کہ کسی دباؤ یا زبردستی کے۔

۷۔ انسانوں کے تمام طبقات کے درمیان برابری پیدا کرنا جس سے انکا رتبہ بلند ہو اور امتیازی حیثیت اسی کو حاصل ہو جس کا عمل معیاری ہو۔

۸۔ تقلید کو جڑ سے اکھاڑ دینا جو انسان کی فکری آزادی ختم کرتی ہے اور جستجو کرنے اور استنباطی طریقہ کار کی انسانی صلاحیتوں کو کمزور کرتی ہے۔

۹۔ عمل کا نتیجہ اس حد تک ملتا ہے جتنا اس کی ذات پر اثر ہوا ہو نہ کہ بدلے میں کچھ دے کر یا سفارش سے۔

۱۰۔ عام سنتوں (طریقہ کار) کا بیان کرنا جو کہ طبعی قوانین اور نظام سے عبارت ہیں جن کی جستجو سے القدر (پیمانہ) اور میزان کے معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ اسطرح علم کا انکشاف ہوتا ہے اور ایمان بڑھتا ہے۔

۱۱۔ یہ دوسری کتابوں پر نگران ہے جو فلسفیانہ بحثوں پر فیصلہ کرتی ہے اور اس کا فیصلہ بھی کہ مذاہب میں کیا صحیح ہے۔ یہ تمام لوگوں کو ایک قابل قبول طریقہ کار پر جس میں تمام کتابوں کا ملخص ہو جمع کرتی ہے اور رسولوں کے مابین کوئی فرق نہیں کرتی۔

۱۲۔ اس میں ایسے قصوں اور واقعات کا ذکر ہے جن سے فائدہ اٹھایا جا سکے یا عبرت حاصل کی جا سکے۔

۱۳۔ اس کی ہدایت عمومی ہے اور اس کے احکام زمان و مکان میں ہر قوم کے مفاد میں ہیں۔ ان قوانین کے برعکس جنکو ہر دوسرے روز منسوخ کیا جاتا ہے یا رہنے دیا جاتا ہے۔ حتی کہ ایک مملکت میں وضع کردہ متعدد احکام رائج ہوتے ہیں۔

۱۴۔ اس کے معانی میں مشابہت ہے تاکہ فہم کا دائرہ وسیع ہو۔

۱۵۔ مسائل کو بار بار دہرانا اور قصص کو احکام کے ساتھ ملانا تاکہ مختلف طریقوں سے ہدایت کی روح پھونکی جا سکے۔ انسان ان باتوں کا

زیادہ اثر لیتا ہے جنہیں دہرایا جائے اور یاددہانی کرائی جائے۔

۱۶۔ حکومت کی بنیاد مشاورت پر رکھی اور فیصلہ دیا کہ اقتدار امامت کے پاس رہے تاکہ ظلم اور انفرادی حکومت کا خاتمہ ہو جو ارادے کو کمزور کرتی ہے اور منافقت اور بزدلی پیدا کرتی ہے۔

۱۷۔ انسان کو اس بات کا اختیار دیا کہ غلط کام کرنے والے سے عدل کی بنیاد پر بدلہ لے لے یا اس سے درگزر کر دے اگر اسی میں بہتری کی گنجائش نکلتی ہو تاکہ لوگوں کے دلوں میں عزت بڑھے اور ہر فرد اپنی محنت اور ترقی کی لذت چکھ لے۔

۱۸۔ اس کا معاشرتی نظام جو فضیلت اور حسن سلوک پر قائم ہے۔

۱۹۔ یہ کتاب علم دوست ہے اور فطرت کے ساتھ چلتی ہے۔ عقل کو دلیل سے قائل کرتی ہے اور نصیحت کے اچھے انداز سے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۲۰۔ یہ کتاب جسم اور روح دونوں کی ایک ساتھ اصلاح کرتی ہے جس سے انسانوں کو دنیا اور آخرت میں خوشی کی ضمانت ملتی ہے۔ القرآن اپنی ان خوبیوں کی بدولت اس قابل ہے کہ اسے باقاعدگی سے پڑھا جائے تاکہ یہ اخلاق اور نفس کا حصہ بن جائے نہ کہ اسے قانون کی دوسری کتابوں کی طرح ضرورت کے تحت دیکھا جائے۔ اسے باقاعدگی سے پڑھنے سے اس کے نئے معانی سامنے آتے ہیں جن سے علم کا احیاء ہوتا ہے اور ہدایت عام ہوتی ہے۔

قرآن فہمی میں اختلاف ٹکڑوں میں بٹنے یا تفرقے کی طرف نہیں لے جاتا

یہ امر باعث حیرانی ہے کہ القرآن میں اتنی خوبیاں ہوں اور ہم اس سے اعراض برتیں اور اسے نہ تھامیں۔ اس سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ہم فرقوں میں بٹ جائیں۔ اگر ہم میں سے کسی کی کوئی رائے ہو یا اپنی فہم ہو تو مخالف لوگ اس پر لعن طعن کرتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی تفرقہ بازی ان بڑے اسباب میں سے ایک ہے جنہوں نے مسلمانوں کو ذلیل کیا ہے اور انہیں دوسروں کا غلام بنایا ہے۔

یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان سمجھ لیں کہ القرآن ان کے درمیان قدر مشترک ہے اور اس کے اللہ کی طرف سے ہونے کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے مفاہیم میں وسعت ہے اور اس قابل ہے کہ یہ ہر زمانے میں اختلاف رائے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ متشابہ (ملتا جلتا ہے) یعنی اس میں متعدد ملتے جلتے معانی ہیں جو دیکھنے والے کو نظر آتے ہیں۔ معانی یا فہم میں اختلاف سے لوگوں کا کچھ نقصان نہیں ہوتا اگر وہ اس کے محکم اور بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کریں۔ یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اور صالح اعمال کریں۔ (دیکھئے آل عمران)

تفاسیر قرآن کا ترجمہ ہیں لیکن اس پر حجت نہیں ہیں

ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ القرآن تمام تفاسیر اور مفاہیم سے بالاتر ہے۔ یعنی تفسیروں سے نہ تو اس کے معانی کو پابند کیا جاسکتا ہے نہ اس کے مقاصد کو محدود کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ اس پر حجت ہیں۔

مفسروں کی آراء ان کے ماحول اور حالات سے پھوٹتی ہیں اور یہ بدلتی بھی ہیں اور نئی بھی سامنے آتی ہیں۔ لہذا جو آراء زمانہ گزرنے کے ساتھ جامد ہو جائیں وہ امت کو پیچھے کی طرف لے جاتی ہیں اور القرآن کو ان آراء میں قید کرنا اس کے لئے نقصان دہ ہے کیونکہ اس سے یہ ہر زمانے کے لئے قابل عمل نہیں رہتا اور اس کی وسعت تنگی میں بدل جاتی ہے۔

اختتامی فریضہ

ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ جو کچھ سمجھتا ہے اس پر عمل کرے تاکہ اس کا قائل ہو جائے اور دوسروں کا بغیر دلیل کے اتباع نہ کرے۔ اور جو عمومی معاملات ہیں تو اس کے لئے اہل شوریٰ سے رجوع کیا جائے جو علماء میں سے ہوں اور وہ اپنے اجتہاد سے جس بات پر عمل کا فیصلہ کریں اس کا اتباع اور اس پر عمل کرنا سب پر واجب ہوگا۔ امت میں سے کسی گروہ کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ اس سے اختلاف کرے تاکہ امت کی وحدت اور اس کا اجتماعی نظام باقی رہے۔

باعمل علماء ہی امت کو الدین میں جمع رکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنے عمل سے واضح کرتے ہیں کہ اس کا اطلاق ہر زمانے کے لئے فائدہ مند ہے۔

پوری امت اس کتاب کی حاکم بھی ہے اور رعایا بھی اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کی ذمہ دار بھی ہے۔ جو بھی کوتاہی یا لاپروائی ہوتی ہے تو اس کے نتائج مشترکہ طور پر بھگتی ہے۔

ومن یسلم وجھه الی الله وھو محسن فقد استمسک بالعروة الوثقی ، والی الله عاقبة الأمور

☆.....☆.....☆

ایک نکتہ

بنجر پاکستان میں باغبانی، جنگل کاری اور آبادکاری کے لئے تمام بے کار افرادی قوت کا صحیح استعمال ہی ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی ہے جو یہ حل کر دے!

(باغبان ایسوسی ایشن)

باب المراسلات

محترم محمد سلیم اختر صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

امید ہے آپ بخیریت ہونگے۔ محترم اللہ دِتا صاحب کا خط بھیجنے پر آپ کا بہت بہت شکریہ۔ محترم اللہ دِتا صاحب سے ذاتی طور پر میری شناسائی نہیں ہے مگر ان کے خط کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق، مفکر اور باریک بیں مطالعہ کرنے والے سکالر ہیں، جیسا کہ بعد میں آپ نے بھی تصدیق کی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ دِتا صاحب جیسی علم وبصیرت رکھنے والی شخصیت نے میرے مضمون کو اتنی دلچسپی اور باریک بینی سے پڑھ کر نہ صرف چند غلطیوں کی نشاندہی کی بلکہ ''مستقبل بینی'' کے معاملے میں یہ کہہ کر میری راہنمائی بھی کی ہے کہ ''اِس کی تائید آیات 59:18 اور 20-2:219 سے بھی ہوتی ہے''۔ دراصل یہ پروفیسر برونوسکی کی عبارت کا اقتباس ہے جس میں پروفیسر صاحب کہہ رہے ہیں کہ مستقبل میں جھانکنا صرف انسان کی منفرد صلاحیت ہے جو ہر جانور کی ''صلاحیت'' سے آگے کی چیز ہے۔ محترم اللہ دتا صاحب نے میرے مضمون میں سے جن چار غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ان میں تین غلطیوں کا تعلق محض کمپوزنگ سے ہے۔ ان میں ''مضغة''، ''تخلیق'' اور ''زمین'' کی غلطیاں ہیں۔ میرے محدود تجربے کے مطابق کم از کم موجودہ دور میں کمپوزنگ کی غلطیوں سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لہٰذا اس ناگوار صورتِ حال کو بہرکیف برداشت کرنا پڑے گا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ مقابلتاً طلوع اسلام کا معیار بہتر ہے۔ چوتھی غلطی لفظ ''نکرے'' کی ہے۔ محترم اللہ دتا صاحب کا کہنا ہے کہ یہاں لفظ ''نکرہ'' ہونا چاہئے۔ میری گذارش یہ ہے کہ یہ لفظ علامہ رحمت اللہ طارق مرحوم کی عبارت کے اقتباس میں آیا ہے۔ میرا اس بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں۔ بہرحال میں محترم اللہ دتا صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امید رکھتا ہوں کہ ان کی طرح دیگر اہل علم حضرات بھی میری راہنمائی اور حوصلہ افزائی فرماتے رہیں گے۔ اسی اثنا میں اسلام آباد سے محترم اویس درانی صاحب نے بھی فون پر حوصلہ افزائی کی ہے میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ وہ بھی قرآن پاک کی تشریح وتوضیح کررہے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں تولید کے ضمن میں لونیوں کا ذکر کیا تھا کہ نطفے میں چھوٹے چھوٹے دھاگہ نما کیمیائی پیکٹ ہوتے ہیں جس کی نوع انسانی میں تعداد 46 ہوتی ہے۔ 23 نطفے میں اور 23 بیضے ہیں۔ ہر نوع میں ان کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً نوع انسانی میں ان کی تعداد 46، ایک قسم کے پودے فرنز (Ferns) میں 600 اور ایک قسم کی مکھی میں صرف چار لونیے ہوتے ہیں۔ بل برائسن

کے مطابق لونیے (Chromosomes) 1888ء میں اتفاقی طور پر دریافت ہوئے اور انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کہ وہ رنگ چوسنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور خوردبین کے نیچے آسانی سے دکھائی دیتے تھے۔ لونیوں کو باہم وابستہ رکھنے میں DNA کا اہم رول ہے اور وراثت سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ محترم اللہ دتا صاحب کا کہنا ہے کہ لونیوں کی تعداد کی تصدیق آیت 35:28 سے بھی ہوتی ہے جس کا حوالہ انہوں نے اپنے ایک ہفتہ وار درس میں بھی دیا تھا۔ میں محترم اللہ دتا صاحب کی طرف سے دی گئی تفصیلات جاننے کا سخت متمنی ہوں کیونکہ میں ابھی تک آیات 35:28 ;16:13 اور 39:21 میں موجود لفظ ''الوان'' کا تعلق مختلف رنگوں سے سمجھتا ہوں یعنی ہر نوع کے ''افراد'' میں لونیوں کی تعداد ایک ہی رہتی ہے جبکہ ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالودود مرحوم نے بھی الوان اور لونیوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ آیت 35:28 کے متعلقہ حصے کا ترجمہ انہوں نے یوں کیا ہے۔ ''انسانوں' جانوروں اور چوپائیوں میں بھی مختلف رنگ ہیں''۔ آیت 30:21 میں زبانوں (السنہ) اور الوان کے اختلاف کو نشانیاں (معجزات) قرار دیا گیا ہے۔ علامہ پرویزؒ نے یہاں الوان سے مختلف نسلیں بھی مراد لی ہیں اور مختلف رنگ بھی' وہ لکھتے ہیں ''لیکن اگر اَلْوَانٌ کے معنی عام رنگ میں لئے جائیں تو بھی اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ دورِ حاضر کی تحقیق ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کی ذہنی سطح کیا تھی تو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں کو پہچان سکتی تھی۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہوگی' اتنی ہی بلند اس کی ذہنی سطح ہوگی۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسان کی ذہنی نشوونما سے خاص تعلق ہے''۔ انہوں نے یہ تشریح ڈاکٹر Bucke کی کتاب (Cosmic Consciousness) کے حوالے سے کی ہے۔ باایں ہمہ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ محترم اللہ دتا صاحب نے الوان سے لونیوں کا کسی قرینے سے ہی تعلق ظاہر کیا ہوگا۔ پاکستان کے نقشے کے بارے میں موصوف کے تبصرے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں درستی' صحت اور راستی (Accuracy and Correctness) کے خواہشمند ہیں۔

فقط

آپ کا مخلص

راجہ عبدالعزیز خان دہیر کوٹ آزاد کشمیر

☆.....☆.....☆

محترم محمد سلیم اختر صاحب!

السلام علیکم! محترم راجہ عبدالعزیز خاں صاحب آف دھیر کوٹ آزاد کشمیر کا آپ کے نام لکھا ہوا خط ملا۔ علاوہ دیگر باتوں کے انہوں نے تولید کے ضمن میں لونیوں کے حوالہ سے قرآنی آیت 35:28 سے متعلق میرے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت طلب فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ابھی تک آیات 35:28 ;16:13 اور 39:21 میں موجود لفظ 'الوان' کا تعلق مختلف رنگوں سے سمجھتے ہیں۔ یعنی ہر نوع کے افراد میں لونیوں کی تعداد ایک ہی رہتی ہے جبکہ ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالودود مرحوم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے بھی الوان اور لونیوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ یہ کہ آیت 35:28 کے متعلقہ حصے کا ترجمہ انہوں نے یوں کیا ہے ''انسانوں جانوروں اور چوپائیوں میں بھی مختلف رنگ ہیں..... اسی طرح علامہ پرویزؒ نے یہاں الوان سے مختلف نسلیں بھی مراد لی ہیں اور مختلف رنگ بھی''۔

میں نے اپنے ہفتہ واری درسِ قرآن کریم بمقام سرسید میموریل لائبریری' باغبان پورہ جی ٹی روڈ' لاہور میں ستمبر۔ اکتوبر 2004ء کے دوران آیات 28-35:27 کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ آیت 35:28 میں مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ میں واحدۃ کے ضمیر کے ساتھ جمع ''الوان'' کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں رنگوں کے محض تذکرہ سے بڑھ کر (Chromosomes) کا تذکرہ ہے۔ یہی چیز ہے جس کی یہاں مزید وضاحت پیش کر رہا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں' لون' رنگ اور Chrome کی لغوی تعبیر کو سامنے لاتا ہوں کیونکہ ان الفاظ کا مفہوم ذرا زیادہ وسیع ہے اور صرف رنگ مراد نہیں۔

لَوْنٌ (Laun) جمع الوان' اس کے معنٰی ہیں sort, kind, shape, form, exterior, colour اور species۔ (1)

عربی لَوْنٌ۔ اللَّوْنُ۔ ہر وہ خصوصیت جو کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کر دے۔ نوع۔ صنف۔ قسم۔ مختلف چیزوں کا سب سے پہلا امتیازی نشان ان کا رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے معنے رنگ کے ہو گئے۔ (2)

انگریزی زبان میں Colour کا معنی ہے' رنگ۔ لون' ایک بصری احساس جو روشنی کے جواب میں آنکھ کی پتلی پر پیدا ہوتا ہے۔ مرئی خصوصیت جو ہیئت کے علاوہ کسی چیز کی روشنی سے اثر پزیری پر منحصر ہوتی ہے۔ اور جس میں رنگ چمک اور سیری کی صفات بھی شامل ہوتی ہیں۔ (3)

ان تفاصیل سے مقصد یہ بتانا ہے کہ لفظ اَلْوَانٌ کے معنے صرف رنگ نہیں بلکہ اللَّوْنُ ہر وہ خصوصیت ہے جو ایک سے دوسری چیز کو ممتاز کر دے۔

اب آیئے انگریزی لفظ Chrome کی طرف۔ اس کے معنی ہیں' وہ جو مختلف جِلدی یا قدرتی رنگوں کا منبع ہو اور

Chromosomes لونی رشتہ‘ لونی خیطہ‘ لونی خلیۂ زوج کا گھنگریالہ یا دھاگے کے گچھے کی مانند اندرونی حصہ جس کے متعلق یہ خیال ہے کہ جین یا مورثہ کی ترسیل کرتا ہے۔ اسی طرح Chromosome کا معنیٰ کیا جاتا ہے لونیہ۔ لونی جسم۔ عصا یا نخ نما دھاگے کی طرح جسموں میں سے ایک جس میں رنگین جز ہوتا ہے اور جو اپنے اندر جین / مورثہ رکھتا ہے۔ ہر نوع کے لئے مورثوں کی تعداد مقرر ہے۔ یہ مورثے پودوں اور جانوروں کے تمام خلیات کے مرکزوں میں موجود ہوتے ہیں۔ لونی جسیمہ۔

اسی طرح جین Gene کرموسوم کی اکائی یا عنصر ہے جو کسی موروثی خصوصیت کو والدین سے اولاد تک منتقل کرتی ہے اور اولاد میں کسی خصوصیت کی نمو کو متعین کرتی ہے اس کے علاوہ جین Gene میں سالموں کی کیمیائی ترکیب کی تبدیلی کے باعث کسی عضو میں نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جسے Gene Mutation کہتے ہیں۔

اب آیئے آیات 35:27-28 کی طرف

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمان سے پانی اتارا‘ پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی پھل نکالے‘ جن کے رنگ مختلف ہیں‘ اور پہاڑوں میں سے کئی سفید اور سرخ قطعے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ سخت کالے سیاہ ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ○

اور لوگوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں سے بھی کئی ہیں جن کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں‘ اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں بے شک اللہ سب پر غالب‘ بے حد بخشنے والا ہے۔

آیت 13:4 اور اس کا مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیں۔

وَفِى الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۙ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

پھر اس پر بھی غور کرو کہ زمین کے مختلف قطعات‘ ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں (لیکن ان میں) کسی میں انگور کے باغ ہیں کسی میں کھیتیاں‘ کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں‘ اور بعض الگ جڑوں سے اُگتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں‘ لیکن مختلف درختوں کے پھل‘ خوبیوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں (ایک میں ایک خوبی ہے تو دوسرے میں دوسری) اس طرح ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

ان امور میں ان لوگوں کے لئے جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں‘ ہمارے نظامِ ربوبیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

ہر دو حوالوں میں ایک سی آب رسانی اور متصل قطعاتِ زمین کے حوالہ سے زمینی پیداوار مثل کھیتی اور ثمرات کو مختلف رنگوں‘ ذائقے‘ تاثیر اور جسامت (اُکُل) میں ایک دوسرے سے بڑھا ہوا بتایا ہے اور اس اختلاف میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں بتائی ہیں۔ ظاہر ہے

کہ ایک ہی زمین سے بیج اور جڑ سے پیدا ہونے کے حوالہ سے ایک تو نوع (Species) ہے۔ جو نہیں بدلتی اس لئے کہ اس کا سبب وہ Chromosomes ہیں جو اس نوع کا خاصہ ہیں البتہ اس کے رنگ' ذائقے تاثیر اور جسامت بدل جاتے ہیں۔ یہ اثر پزیری ہے جو مختلف زمینی عوامل اور ماحولیاتی اثرات کی قبولیت کا اظہار کرتی ہے۔ یہ کروموسومز جنہیں ہم اردو میں لونئے کہتے ہیں' خوراک اور ماحول سے متاثر ہو سکتے ہیں اور ہمارے زیرِنظر موضوع کے اعتبار سے مختلف رنگ اختیار کر سکتے ہیں۔

جب کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ موضوع میرے درس میں سامنے آیا تھا۔ درس میں سیاق وسباق کو مدنظر رکھ کر بات کی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات 35:27-28 سے قبل یہ آیات آئی ہیں:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ○ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (35:25-26)

اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بلاشبہ ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے' ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ اور صحیفوں کے ساتھ اور رَوشن کتاب کے ساتھ آئے تھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنہوں نے کفر کیا تھا تو میرا عذاب کیسا تھا؟

ان آیات میں' رسولوں کی لائی ہوئی واضح دلیلوں اور قوانین خداوندی کی تکذیب پہلے لوگوں کا جرم بتایا گیا ہے اور یہ کہ ان کے کفر کے سبب ان پر گرفت ہوئی۔ زیرِنظر آیات 35:27-28 میں آسمان سے برسے پانی سے مختلف 'الوان' کے پھل پیدا کرنے اور پہاڑوں میں مختلف رنگوں کے قطعات اور دھاریاں اور اسی طرح انسانوں' زمین پر رینگنے اور چلنے والے جاندار اور چوپائیوں کی ہر نوع میں مختلف 'الوان' کا تذکرہ ہے اور ان سب کے بارے میں اللہ کے بندوں میں سے علماء کی حیثیت کا تذکرہ ہے۔ اگر یہ مختلف الوان محض بصری احساس یا جمالیاتی ذوق کی تسکین یا رنگ شناسی کی بات ہوتی تو اسے انسان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل کے حوالہ سے سمجھا جا سکتا تھا لیکن بات ذرا زیادہ وقیع ہے۔ وہ علماء جو ان اختلافاتِ الوان کے اسباب وحقیقت سے آگاہ ہیں ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے متعلق خشیت کا رویہ واحساس رکھتے ہیں۔ خشیت کا عام ترجمہ ڈر یا خوف کیا جاتا ہے لیکن اس لفظ کے مادہ ''خ ش ی'' کے مطابق کسی نقصان کے احتمال سے خوف زدہ ہو جانے کے لئے خشعۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے نیز اس میں احتمال' امید' توقع اور علم کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ خشیۃ اللّٰہ کے معنیٰ ہونگے قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج اور عواقب کا احساس جس کے ساتھ توقع' احتمال' اندیشہ اور علم کا پہلو بھی مضمر ہو۔ ان قوانین کے غیر متبدل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی۔ ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم نے اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے۔

(علماء) really appreciate the mighty powers of laws of Allah.

دراصل appreciate کرنا۔ پورے مفہوم کو ادا نہیں کرتا کیونکہ یہ صرف ان کے علم کے حصول تک جاتا ہے اور قوانین خداوندی کی خلاف ورزی پر اندیشہ یا آیت 35:25-26 محولہ بالا میں مذکور تکذیب وانکار کی وجہ سے عذاب کے احتمال کی بات نہیں کرتا۔

درحقیقت آیت ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو کسی چھپی ہوئی شے کا لازمی خاصہ ہو اور جب کوئی شخص اس ظاہری شے کا ادراک کرلے تو وہ جان لے کہ اس نے اس پوشیدہ شے کا ادراک یا اندازہ کرلیا ہے۔

ان آیات 35:27-28 میں نظر بظاہر تین گروپ بتائے گئے ہیں (1) زمینی زرعی پیداوار بشمول ثمرات۔ (2) زمینی ساخت/پہاڑوں کی مختلف تہیں۔ (3) زمین پر زندگی (حیوانی سطح) کے تین شعبے انسان، دوآبّ اور انعام (چوپائے) اور ان میں مختلف رنگوں کا حوالہ ہے۔

ظاہر ہے کہ نباتات میں مختلف رنگوں (Pigments) اور تبدیلیٔ الوان کا قانون الگ ہے جو حیات کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ جمادات (مثل زمین، پتھر، پہاڑ) ان میں اختلافِ الوان اور تبدیلیٔ الوان کا قانون، زندگی کے بغیر، کیمیائی تعامل پر مبنی ہے اور انہی قوانین کے تحت کنٹرول ہوتا ہے۔ لیکن متحرک زندگی میں (انسان، دوآبّ اور چوپائے) الگ قانون کے تحت اختلافِ الوان اور ان کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ نباتات میں مختلف نباتی نوعوں کے الگ الگ رنگ ہونے کے ساتھ ساتھ، ایک ہی نوع میں تغیرِ الوان کا عمل بھی جاری رہتا ہے، جو سبزی سے پیلا اور پھر ٹوٹ پھوٹ کے بعد سیاہ ہو جاتا ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھیں 39:21۔ یہ الگ قانون ہے۔

متحرک (چلنے پھرنے والی) زندگی میں، ہر نوع کا تعین اس کے سیل (Cell) کے مرکزہ میں Chromosomes کی تعداد پر منحصر ہے اور دوآبّ کی چند اقسام کے علاوہ انسانوں اور انعام میں پیدائشی رنگ میں بالعموم تغیر واقع نہیں ہوتا سوائے کسی بیماری یا "Cosmic Effect" کے۔ البتہ مختلف زمینی علاقوں، موسموں اور درجہ حرارتوں میں رنگ مختلف ہو جاتے ہیں اور یہ عمل ایک دونسلوں میں واقع نہیں ہوتا۔ "Melanin" کی جلد میں موجودگی یا اضافے سے رنگ کا فرق پیدا ہو جاتا ہے یا علاقائی زمینی اثرات اس کا باعث بنتے ہیں جیسے زرد نسل۔

ان حقائق کے پیش نظر دو سوال میرے سامنے آئے۔ پہلا یہ کہ زرعی نباتی پیداوار کا قرآن کریم میں تذکرہ واحد اسم (زرعاً) سے ہوا ہے اور الوان کی نسبت/رجعت بھی ضمیر واحد سے مذکور ہے۔ اَلْوَانُهٗ (39:21 ;16:13)۔ زیر نظر آیات 35:27-28 میں پہلے ثمرات کا تذکرہ ہے اور ثمرات کے اسم جمع ہونے کے حوالہ سے مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا آیا ہے جو 'ھا' غیر عاقل یا جمادات کے لئے جمع کی ضمیر ہے۔ اسی طرح جِبَالٌ۔ جَدَدٌ جمع اسموں کے حوالہ سے ضمیر بھی جمع 'ھا' استعمال ہوئی ہے لیکن الناس، دوآبّ اور انعام جمع اسموں کے باوجود، من کے قرینہ کے پیش نظر، ضمیر الوانہٗ میں ہٗ واحد ہے جبکہ رنگوں۔ اَلْوَانٌ کو جمع لایا گیا ہے۔ عربی زبان کی رُو سے اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اَلْوَانٌ مختلف ہیں۔ افرادِ نوع کے رنگ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن الوان کو جمع لانے سے ایک واضح قرینہ موجود ہے کہ ہر نوع میں الوان (رنگین جسیموں) کی تعداد مختلف اور متعین ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے Chromoromes کہتے ہیں۔ رہی بات تغیرِ الوان کی، تو یہ تغیر ہر نوع میں کروموسومز پر موجود Genes کے سبب ہوتا ہے جو باہمی تعامل کے سبب مختلف کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے حامل حیوانی جوڑے میں رنگ (علاوہ دیگر فیچرز کے) متعلقہ Dominant جین کے مطابق ظاہر ہوتا

ہے جبکہ Recessive جین پس منظر میں چلا جاتا ہے اور پھر کبھی ظاہر ہوتا ہے جب وہ بطور Dominant جین اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ہر کسی کو معلوم ہے کہ

"Colour of plants, animals, rocks, minerals and infact of all the living and non living objects around us, varies with their chemical and physical structure."

انسانوں، دوآب اور چوپائیوں کا فزیکل سٹرکچر (ڈھانچہ) Genes کے تعامل پر مبنی ہوتا ہے جو بہرحال Chromosomes پر ہی واقع ہوتے ہیں۔ کروموسومز تو ہر نوع میں وہی مقررہ تعداد میں ہوتے ہیں البتہ ماحول، موسم، درجہ حرارت، زمینی پس منظر اور خوراک کے اجزا سے متاثر ہو کر Genes اپنے مختلف افعال ادا کرتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے 35:28 میں **مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

متحرک زندگی کے علاوہ نباتی اشیاء میں بھی ماحول، خوراک، موسم اور انسانی عمل دخل (Grafting) وغیرہ سے اشیاء اور ثمرات کے رنگ، ذائقے اور سائز وغیرہ میں تغیّر آتا ہے (13:4)۔ قرآنی راہنمائی کے پیش نظر نباتی اور حیوانی Genes پر ماحول اپنا اثر ڈالتا ہے جسے مدنظر رکھنا ہوگا اور یہی ''علماء'' کی ذمہ داری ہے۔

دوسرا سوال یہ کہ علماء کو متعلقہ حصولِ علم سے کیا خشیہ لاحق ہوتا ہے، وہ کس قانون کی خلاف ورزی کے برے اثرات سے خوف زدہ ہوتے ہیں، تو اس سلسلے میں عرض ہے۔ کہ جمادات میں کیمیاوی تعامل کی خلاف ورزی سے نقصان رساں یا تباہ کن نتائج کا پیدا ہونا مابہ النزاع نہیں ہے۔ البتہ نباتات وحیوانات میں بہت دیر تک اس پر کم توجہ دی گئی۔ نباتات میں Grafting اور حیوانات میں Cross breeding کا عمل ان میں تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ Grafting سے انسان نے نباتات اور پھلوں میں بے شمار پودے اور ثمرات بنائے ہیں۔ آموں میں سونفیہ۔ دودھیا اور جدید قسمیں وغیرہ اور سنگترہ یا کھٹی سے مالٹا کی اقسام، کینوں فروٹر اور موسمّی وغیرہ پیدا کئے ہیں (یہ ہے ثمرات میں مختلف الوان سے حاصل کردہ علم کا نتیجہ)۔ اسی طرح گھوڑے اور گدھے کے نر و مادہ کے ملاپ سے خچر (بغال) وجود میں آیا جو بعض اوقات / حالات میں ہر دو نسلوں سے زیادہ کارآمد ہوتا ہے لیکن اس سے آگے نسل نہیں چلتی۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں کی دو اقسام کو کراس بریڈ کرانے سے شہد تو زیادہ اور بہتر ہو گیا لیکن ان کے ڈنگ مارنے کی صلاحیت بڑھ گئی جس سے اس نے شہد اور اپنی حفاظت کا بہتر انتظام کیا لیکن وہ انسانیت کے لئے فائدہ مند نہ ہوئی تو اسے ختم کرنا پڑا۔ دیگر حیوانی مثالیں، کتوں اور گائے بیل وغیرہ میں سامنے آئی ہیں۔

اب آیئے تیسرے گروپ کی نوع انسانوں کی طرف۔ اس میں کروموسومز اور Genes کے اثرات سے انکار نہیں ہوسکتا۔ انسانوں میں سفید اور کالے لوگ اگر الگ الگ رہیں تو کالے لوگ اس زمانہ میں سفید لوگوں سے I.Q. میں 15 نمبر کم ہیں جس کا سبب

ماحول، سہولیات، تعلیم اور تربیت ہے۔ اسلام کی رُو سے تشکیل امت میں جب رنگ اور نسل کی بنیاد ختم کر کے اخوت قائم کی گئی تو یہ فرق ایک سوالیہ نشان بن گیا ان سفید، کالی، زرد اور گندم گوں نسلوں کو جب قریب تر لایا گیا تو کبھی دو ملنے والی نسلوں کی اچھائیاں نئے بچوں میں آ گئیں اور کبھی دو نسلوں کی خرابیاں نئی نسل کا نشان بن گئیں۔ یہ ہے وہ مقام جس سے ایک عالم کے لئے خشیہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ متحرک زندگی میں مؤنث اور مذکر کے ملاپ کے وقت، خصوصاً انسانوں میں سیکس کروموسومز کی گروپنگ XX ہوتی ہے تو مؤنث کی پیدائش ہوتی ہے، XY ہو تو مذکر اور Monosomy XO ہو تو ضیاع حمل اور XXY ہو یعنی Trisomy-21 ہو تو ذہنی پس ماندگی اور بے اولاد مرد کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقصان Catastrophe کا سبب Chromosomic یا genetic defect ہوتا ہے جسے Down Syndrome کہتے ہیں۔ صاحبانِ علم نے اس دور میں اس میدان میں خاصہ کام کیا ہے اور ایک نئے شعبہ علم Genetic Engineering میں ابتدائی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

جیسا کہ قرآنی آیات میں کسی نوع کی اپنی خصوصیات (Nature) اور ماحول، خوراک، موسم اور حرارت (Nurture) کے سبب تبدیلیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح نوعِ انسانی یا دیگر حیوانات میں ان عوامل کو عمل دخل حاصل ہے۔

The role of nature and nurture and their interaction, determines the development of personality and I.Q.

دیکھنا یہ ہے کہ کروموسومز اور Genes کی حامل نوعوں کو جو ایک خاص ماحول، خوراک اور تربیت کے نظام میں رہی ہوں، کیا مناسب تبدیلیٔ ماحول، خوراک اور تعلیم و تربیت سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کا اشارہ اسی طرف ہے۔ انسانی دنیا میں وہ ایک ایسے انسانی معاشرہ کا قیام کرنا چاہتا ہے جہاں ہر انسان کو اس کی بنیادی ضروریات اور حقوق حاصل ہوں اور اس کی جسمانی اور نفسیاتی نشو ونما اس کے اپنے خوابیدہ جوہروں کی تکمیل کا باعث بن سکے۔

یہ مرحلہ تو Nature اور Nurture کا تھا۔ اگلہ مرحلہ تغیرِ نفس کا ہے جس کے لئے وحی کو بنیاد بنا کر تعلیم و تزکیہ سے اگلے مراحل طے کئے جا سکتے ہیں (2:31، 2:37-38، 2:151، 3:164، 4:113، 62:2، 91:7-10) اور خشیۃ اللّٰہ کے موارد کو 76:28، 56:60-62، 14:19-20 اور 31:33 میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

والسلام

خیر طلب

اللہ دتا

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

☆.....☆.....☆

محترم جناب محمد اکرم راٹھور صاحب ناشر و قائم مقام چیئرمین ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

السلام علیکم!

آپ کو معلوم ہے کہ علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کے استاذِ معظم علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری (1955-1882) کی تصانیف ''تاریخ اسلام کا جائزہ قرآن کی روشنی میں''، ''سیرتِ رسولِ کریم'' تعلیماتِ قرآن' نکاتِ قرآن' تاریخ القرآن' تاریخ الامت' نامور مسلمان خواتین وغیرہ دوست ایسوسی ایٹس پرنٹرز' پبلشرز' الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور نے 1993ء تا 1996ء شائع کی تھیں جو کہ قرآنی علوم کے بہت قیمتی خزانے ہیں اور وہ غالباً اسوقت آپ کے مؤقر ادارے میں برائے مطالعہ اور فروخت دستیاب نہیں ہیں۔ آپ سے مودبانہ درخواست ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں کو ادارے کی لائبریری اور فروخت کے لئے مہیا کر کے ثواب دارین حاصل فرمائیں۔ ان کتابوں میں سے پہلی کتاب یعنی تاریخ اسلام کا جائزہ قرآن کی روشنی میں 1950ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ دوست ایسوسی ایٹس نے 1993ء اور 1995ء میں اس کے دو ایڈیشن شائع کئے تھے۔ اس کتاب کی تحریر اتنی تازہ اور مؤثر ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ ابھی ابھی تصنیف ہوئی ہے۔ اس کا آخری مضمون یعنی 'خاتمہ' نیچے نقل کیا جا رہا ہے جس میں نظامِ اسلام کو نہایت مجملاً اور مختصراً واضح کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

خاتمہ

''قرآن کریم میں ہر صاحب بصیرت غور کرنے سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے یعنی وہ جملہ نوعِ بشر کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔ بیشک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیۂ باطن اور ان میں تقویٰ پیدا کر کے ان کو ملت کا جزو صالح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی اجتماعی زندگی صالح العمل ہو جائے۔ یہ نظام اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ پانچ ارکان کی ادائیگی پر قائم ہے جن سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہو سکتی ہے یعنی توحید نماز زکوٰۃ روزہ اور حج۔ یہ آخری رکن جو اسلام کے مرکزی مقام مکہ میں ادا کیا جاتا ہے امت کی اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لئے ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم آج بھی اپنی بگڑی کو سنوار سکتے ہیں اگر خلوص دل سے کوشش کریں۔ اس لئے اس کی کیفیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں۔

بیت اللہ توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں انہوں نے بحکم الٰہی اس گھر کو اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے بنایا اس وقت جبکہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (3:96)

پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ جو کہ مکہ میں ہے برکت والا اور دنیا جہان کے لئے ہدایت۔

جب گھر بن گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کے لئے آیا کریں۔

وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ (22:27)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔

یہ اعلان کل انسانوں کے لئے کیا گیا جیسا کہ فی الناس لفظ سے ظاہر ہے لیکن مراد یہاں بنی نوع انسان کے موحد ہیں کیونکہ اس گھر کی بنیاد ہی توحید پر ہے اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ بند کر دیا ہے۔

اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا یَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ (9:28)

مشرک تو نجس ہیں وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے کہ روز اول سے وہی دین الٰہی ہے، جملہ انسانوں کو ایک جیسا قرار دیا ہے اور نسل، رنگ، ملک یا زبان کے اختلاف نے ان میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ صرف ایک تفریق کو وہ ضروری قرار دیتا ہے یعنی اسلام و کفر کی جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعہ سے ملی ہوئی صحیح تعلیم کے تابع وہ حزب اللہ ہیں اور جو شرک یا کفر میں مبتلا ہیں حزب الشیطان ہیں۔ یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔ الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا اور خاتم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے ملتِ اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنایا۔

آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے حج کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ہر سال اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آ کر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے نہ صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے۔

جَعَلَ اللّٰہُ الۡکَعۡبَۃَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّہۡرَ الۡحَرَامَ (5:97)

اللہ نے کعبۃ بیت الحرام کو انسانوں کے لئے دارومدار قرار دیا نیز ماہ حرام کو۔

اس آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ کعبہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے جہاں سے اجتماعی امور کی اصلاح عمل میں آئے گی جس زمانے میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم قرار دیا جس میں ہر قسم کے جھگڑے روک دیئے جائیں گے تاکہ لوگ امن کے ساتھ اس میں شریک ہو سکیں۔

اس اجتماع کی غرض بھی صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کر دی۔

لِّیَشۡہَدُوۡا مَنَافِعَ لَہُمۡ (22:28)

تاکہ اپنے فائدے کے لئے حاضر ہوں۔

یہ فائدے کچھ اخروی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ دینی دنیاوی ملکی اور ملی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم کی خرابیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان کیا۔

سَوَآءَ ِالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (22:25)

اس میں باشندے اور باہر والے یکساں ہیں۔

جس کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا اور وہاں کے کسی باشندے کا یہ حق تسلیم نہیں کیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی منع کرتے تھے اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

حج کی صحیح صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے مسلمان مکہ میں آئیں پہلے سے اپنا اپنا ایک ایک امیرِ حج منتخب کرلیں یہ امراء حج نہ صرف یہ کہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے حاجیوں کے قیام وطعام کا مکہ میں بندوبست کریں بلکہ ان کے نمائندے اور ترجمان بھی ہوں پھر یہ سب کے سب امراء مکہ میں باہم مل کر بیٹھیں۔ تبادلہ خیالات کرلیں تاکہ ہر اسلامی ملک اور قوم کی دینی اور دُنیاوی حالت اجتماعی لحاظ سے ان کے سامنے آجائے۔ انہی امراء میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمعِ عام میں ایک خطبہ دے جس میں ملت کی پوری اجتماعی حالت پر تبصرہ اور ان کی رہبری ہو اور ایک سال کا اجتماعی لائحہ عمل۔

عرفات سے پلٹ کر حجاج مقامِ منا میں آجاتے ہیں یہاں تین دن ٹھہرتے ہیں قربانیاں کرتے ہیں اور کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ قوم کے افراد اپنی قربانی کی رقمیں اپنے امراء کو دے دیں وہ ضرورت اور اندازہ کے مطابق قربانیاں کرے ایک جگہ پکوائے اور سب ایک ساتھ مل کر کھائیں۔ اقوام مسلمہ جن کا دماغی تعارف امراء کے ذریعے سے مکہ میں ہو چکا ہے یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کرکے آپس میں تعارف پیدا کریں تاکہ باہمی الفت اور اخوت سے وحدتِ ملی کا احساس بڑھے۔

تشریق کے ان تین دنوں میں ہر جماعت کے امیر کو عرفات کا خطبہ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیے۔ اب جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے گا وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے گا اس سے تمام عالمِ اسلامی میں اجتماعی روح بیدار ہوجائے گی۔

ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لیے نصب فرمایا ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے۔ ان سب منبروں کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدت ہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب بے نور افسردہ اور منتشر ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف نصبِ مرکزیت ہے اور کچھ نہیں کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد خود بخود متوجہ ہوجاتا ہے جس سے ساری قوم منظّم ہوجاتی ہے جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ امت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ ناکامی ہوگی اس لئے کہ یہ الٹا راستہ ہے۔ اس طرح پر ہم اپنے حج کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر ہر اسلامی خطہ کی آزادی کی کوشش کرسکتے ہیں (جیسا کہ کشمیر۔ مدیر) ممکن ہے کہ انقلابات جو عجلت کے

ساتھ اقوام وملل پر آ رہے ہیں ان میں ایسا وقت آ جائے کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد جمہوریتیں قائم ہو جائیں پھر ہماری یہی مکہ کی بین الاقوامی انجمن ملّت کا مرکز بن جائے گی۔

اب میں اپنی ایک نظم پر جو عرصہ ہوا 'طلوعِ اسلام' میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملت
کہ جس کا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی نظام
ہو گرچہ ریگِ بیاباں کی طرح لاتعداد
ہوا کے جھونکوں میں اڑتی پھرے گی صبح اور شام
اگر ہو نظم تو ملت ہے آہنی دیوار
کہ جس کے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے قیام
یہ نظم کیا ہے فقط ایک نقطۂ مرکز
زبانِ شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام
ہیں اجتماعی مقاصد اسی سے وابستہ
امامِ زندہ ہے ملت کی زندگی کا قوام
جہاں کی دوسری قوموں کا ہے نسب پہ مدار
مگر ہے ملتِ اسلام جامع الاقوام
اساس اس کی ہے بس ''لا الہ الا اللہ''
اسی اساس پہ قائم ہوئی اخوتِ عام
نہ کوئی نسل نہ کوئی زباں نہ کوئی ملک
ہے امتیازِ سیاہ و سفید و سرخ حرام
ہے اس کے ربط میں قوموں کا ارتباط بہم
ہے اس کے نظم میں دنیا کی امتوں کا نظام
یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم
سپرد کی گئی اس کو امامتِ اقوام
امام ملتِ اسلام نائبِ حق ہے
تمام اہلِ جہاں جس کے حکم کے ہیں غلام
اگر ہے دینِ محمد کا پاس ملت کو
تو آج نصبِ امامت ہے اس کا پہلا کام

اس قبیل کی اپنی ایک دوسری نظم بھی شائع کرائی تھی یہاں اس کو بھی درج کرتا ہوں:۔

انفرادیت ہے اقوام و امم کے حق میں موت
اس کے سایہ سے بھی ہے اقبال کتراتا ہوا
آہ! وہ ملت کہ جو رکھتی نہیں زندہ امام
دمبدم دیکھے گا تو اس پر زوال آتا ہوا
وہ سمجھتی ہے جسے جنت کی راہِ مستقیم
راستہ جاتا ہے وہ دوزخ کو بل کھاتا ہوا
دین و دنیا کچھ نہیں ملتا ہے مرکز کے بغیر
بے سری ملت پہ ہے ادبار منڈلاتا ہوا
اجتماعیت کے اوپر ہے بنا اسلام کی
دیکھتا ہوں میں ادھر مسلم کو پھر آتا ہوا
اس رواقِ نیلگوں میں مجھ کو آتا ہے نظر
اپنی ملت کا ستارہ نور برساتا ہوا''

براہِ کرم طلوعِ اسلام کے قارئین کے استفادہ کے لئے عریضہ ہذا کو اپنے مؤقر جریدے کی قریبی اشاعت میں شامل فرما کر شکر گزار فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش
محمد اقبال
235۔بی بلاک' جوہر ٹاؤن لاہور
فون:35178723۔ موبائل:0342-4127898

☆.....☆.....☆

بنجر پاکستان میں، باغبانی اور جنگل کاری

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے

☆ 2014ء مری میں باغبانی کی 101 ویں سالگرہ ہے

☆ پاکستان بھر کے باغبانوں، زرعی اداروں، زرعی یونیورسٹیوں اور پورے پاکستان کے محکمہ جنگلات اور محکمہ ماحولیات کے دانشور خواتین وحضرات سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ 2014ء کو

''بنجر پاکستان میں باغبانی اور جنگل کاری'' کے طور پر منائیں اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

☆ بنجر پاکستان آباد ہوگا

☆ بنجر پاکستان میں باغبانی ہوگی

☆ بنجر پاکستان میں جنگل کاری ہوگی

☆ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے

☆ غربت کے خاتمہ میں مدد ملے گی

☆ ماحولیات کے لئے یہ سال بطور خاص اہمیت حاصل کرے گا

☆ جہاں مری کے باغبان اپنی 101 ویں سالگرہ منائیں گے وہاں پورے پاکستان کا ساتھ دیتے ہوئے 2014ء کو باغبانی اور جنگل کاری کے طور پر منائیں گے

☆ 100 سالہ پودہ جات میں مری کا آملہ۔ دیسی انار۔ ناکھ ناشپاتی۔ اخروٹ۔ ہاڑی۔ شہتوت۔ بٹنگی۔ پھگواڑی اور ریٹھا کے پودے شامل ہیں۔ لاہور چڑیا گھر کا برگد کا درخت سو سالہ ہے۔ دیگر معلومات درکار ہیں۔

پتہ / رابطہ

(1) ملک حنیف وجدآنی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیو مری

(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن ٹبی سیّداں سوہاوہ جہلم

(3) تنویر صادق نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن میاں چنوں خانیوال

(4) ڈاکٹر حامد حسین نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن بلاک C ڈیرہ غازی خان

(5) طارق ایم ملک شعبۂ نشتر واشاعت باغبان ایسوسی ایشن چارہان نیو مری

(6) احمد نواز خان تاحیات ممبر باغبان ایسوسی ایشن گاؤں گھماواں نوانشہر ایبٹ آباد

Surah *Al-Qiyamah* (القیامۃ) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 24

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends! Today is March 16, 1984 and today's lecture starts with verse 4 of Surah *Al-Qiyamah* (القـیامۃ) (75:4). In the last lecture I had explained نَّفْس اللَّوَّامَةِ. Although the topic was little difficult but I am glad that friends took great interest in it. I had mentioned that what we call "conscience" and what is called نَّفْس اللَّوَّامَةِ by the Quran is not something that it is given to humans in complete form. It does not have the ability, as it is normally understood, to distinguish right from wrong or truth form falsehood. It is the society that produces نَّفْس اللَّوَّامَةِ. Whatever kind of society is, that is what the "conscience" becomes.

Allama Iqbal's explanation of نَّفْس اللَّوَّامَةِ

Allama Iqbal (1877-1938) has summarized this in just two words what I explained in the last lecture. He had a philosophical style. What he said about this "conscience" is worth memorizing. He has said in his book "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" that what we call "human conscience" or نَّفْس اللَّوَّامَةِ is nothing but "Internalized Society". What a beautiful way to put this complex issue in just two words! The society that resides in the heart is what is called "conscience".

In connection with نَّفْس الـلَّوَّامَةِ – that produces guilt or blame in human heart – it is important to remember that the foundation of the *Deen* of Islam rests on the law of requital. This is *the* gist of the Quranic teaching. The law of requital is that every action produces a consequence – even human desire and thought produce consequence. And the appearance of the consequence is not restricted to this world only but it encompasses the Hereafter as well. Life, according to the Quran, is a continuous stream which extends from here to the Hereafter. So does the law of requital. This continuity of life from here to Hereafter was questioned then (at the time of the Prophet) and it is questioned now: How can the human become alive after death when his bones have decayed; when his remains have disappeared in the dust? The Quran does not engage in lengthy arguments about this. It simply asks the skeptics: If Allah can create this entire Universe – including humans – from absolute nothingness; then can He not recreate humans after they are dead? After all there is

something of the remains of them after they have died? This is a very beautiful reply. It is not impossible for Allah to bring humans back to life. Let me emphasize here that the life-after-death is presented by the Quran only in parables and similes. We cannot say what kind of form or shape that life would take because the Quran does not discuss that.

The terms "reward" and "punishment" not appropriate for results of human actions

My dear friends! As Muslims we believe in the life-after-death. We believe that the human being will remember everything about the previous life; that is, his "self" would have the imprint of the results of his entire actions done in the world; and that his status in the Hereafter will be determined accordingly because the Quarn says: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37) – to every one of you, whether he chooses to come forward or to hang back! This is a matter of moving forward or remaining behind in the journey of evolution and, this, in fact, is the law of requital. The Quran has said: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ; بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ (75:3-4) — Does man thinks that after his death he would not be brought back to life again? (And that he would be saved from facing the consequences of his wicked deeds)? Does he think that the foundation on which the whole structure of life is raised will wither away with death and that it cannot be assembled again? Then he is wrong indeed! For Us to do so is not difficult at all. We have the power to reconstruct the faculties which establish his life and which give him control over the use of other things.

The literal meaning of the word بنان is fingers. But its metaphorical meaning is: a thing that serves as clutch for some other thing; a thing which brings some other thing under control. In verse 75:4 it means: human power which brings some other action under control. In this verse Allah says that He has the power to restore human beings to life after death; that it is not impossible for Him to do that. All that Quran wants to convey is that life-after-death is a reality; that this is necessary for the law of requital. The Quran says that human beings who question the foundation on which human life continues after death; who deny the law of requital; who believe that life ends after death – why do they behave like this? The Quran provides the answer: بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (75:5) – None the less man chooses to deny what lies ahead of him. He has become used to enjoying the material aspects of life; used to stolen goods; used to deception and lying to gain advantage; used to easy and comfortable life. And, he wants that life to continue like this; that no one should warn or criticize him. Then

what are Allah's guidance and the warning by His messengers for? Actually, to stop such people and to tell them: so far you had been living a life on the wrong path but no more. This is what bothers them. They do not like to be forewarned of the bad consequences of their wrong lifestyle. Instead, they want to continue to follow the status quo; they like to live the rest of their life the same way. The Quran says this is the real reason for their opposition to its message. The objections put forward by them are really their rationalizations and justificatory reasons. Otherwise, the real reason is that they want to lead the rest of their lives in the same irresponsible way as their current lifestyle. The scape from the consequences of their current irresponsible lifestyle serves as a subconscious barrier against the thought and possibility of life-after-death. But, as I had mentioned before, the foundation of *Deen is* the law of requital. This is the reason, that whenever they are told about the Day of Judgment, they immediately react and there heart is filled with all sorts of objections and doubts and: يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (75:6) – asking [derisively], "When is that Resurrection Day to be?" How great is their self-deception!

Now the question is: Would human beings be saved from the bad consequences of their wrong actions just because they do not believe in the law of the requital? Well! The law of requital will keep working whether or not anyone believes in it. There *will* be life-after-death and the results of actions performed *will* come forward no matter how strongly one may reject this reality. As to when the Day of Judgment would come, only Allah knows it. But when it comes the condition will be such that people will be bedazzled with surprise: فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (75:7) – But [on that Day,] when the eyesight is by fear confounded.

My dear friends! Please remember that a Day of Judgment also comes forth in this world when the results of actions appear here. And a Day of Judgment comes after death when the results will appear there. The Day of Judgment in this world generally appears in the form of confrontation among nations or among different systems of life; and when it appears then the enemies are taken by surprise and completely bedazzled. Their condition will be such that: وَخَسَفَ الْقَمَرُ (75:8) – the moon will be darkened i.e., the power of the Quresh will be finished. If you remember, this has come many times in the past lectures that the moon was symbol of Quresh's flag and the sun that of Iran's. That is the reason the Quran says: وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (75:9) – and the sun and the moon are brought together. That is, Iran and the Quresh will be brought together. If these verses point to the revolution in this world then it refers to the confrontation that occurred between the Arabs and Iran at the advent of Islam.

Whether it be the time of the occurrence of the result here in the world or in the Hereafter, the Quran further says that: (75-10-11) يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ; كَلَّا لَا وَزَرَ – on that Day will man exclaim "Whither to flee?" But nay: no refuge [for thee, O man]!

My dear friends! I have said that the foundation of *Deen* rests on the law of requital. The Quran says: اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ (75:12) – With thy Sustainer, on that Day, the journey's end will be! That day results of all the actions will come out. That is why the Quran says: كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (82:9) – You belie Allah's law of requital? But what could happen from your belying? Nothing! Because: يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ; كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ; وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (82:10-12) – It is a fact that there are ever-watchful forces over you, noble, recording, aware of whatever you do! This is Allah's law of requital in action. Let us discuss كِرَامًا كَاتِبِيْنَ now.

The reality of كِرَامًا كَاتِبِيْنَ

My dear friends! The traditional concept of كِرَامًا كَاتِبِيْنَ that these are angels is okay to explain: that they write everything what man does in a record book of actions; and according to which his reward or punishment is decided. This is alright for explaining it. But the style of the Quran is that it is able to explain matters to humans of all intellectual levels. Here, the matter is to explain that no deed will go unaccounted for; that every deed will be recorded and protected; that it will have its results also recorded and protected; and that there *will* be punishment for wrong deeds. It is explained in this style for common people to understand. But for people of high intellectual level, the Quran has its own unique style for explanation. It says: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ; وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (75:14-15) – nay, but man shall against himself be an eye-witness, even though he may veil himself in excuses. Today, the situation is such that if one asks even the worst evil-doers: Why do you do these evils? Then he starts giving justificatory reasons for his actions; he starts rationalizing and giving strange explanations. Even pathological criminals find ways to justify their actions. The Quran says that you can come up with these justifications today but these won't work there, in the Hereafter. The crooked reasons one gives here to justify a wrong action won't be possible there. What will be the case there? The Quran presents an amazing thing: someone else won't write the judgment; someone else won't announce the verdict; someone else won't punish the criminal. All this won't happen there. The individual will pronounce his own transgressions and crimes; he will announce his own verdict. This is extremely important, my dear friends!

Man will be witness against himself

In connection with human action and its result I normally give example of the person who takes poison: For his punishment there is no need for security guards, police station, court, judge, or jail. His punishment is hidden inside that poison. Similarly for punishment for his bad actions, the Quran says that the man will be witness against himself; he will give evidence against himself, i.e., he will stand against himself. This is the way the Quran describes will be the event-consequence regarding the accountability of actions performed here! There will be no loopholes that man will be able to offer there; there will no arguments that could deceive others or could allow for self-deception – There will be no possibilities of these things in the Hereafter or in a society established on the basis of Quranic values in this world. The believers in these values (i.e., *Momineen*) of that society will never do such things in the first place; neither will they deceive themselves nor will they deceive others. If by chance there are some who behave otherwise, the laws and institutions of justice would be so complete and perfect that arguments based on falsehood and self-deception won't work. At other place the Quran has said about the record of (mis)deeds which is highly revealing and instructive: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (17:13) – And every human being's record of deeds (destiny) have We tied to his neck.

Man's record of deeds tied to his neck

My dear friends! Today, there are many ways to save records. But in old days documents on paper (or parchment) used to be rolled and tied with rope. This became known as document or دستاویز because it was enfolded by hand. Sometimes it was kept inside a cylindrical metal container to protect it from weather elements. Anyway, the Quran says that everyone's record of deeds will be tied to his neck and: وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (17:13) – and on the Day of Resurrection We shall bring forth for him this record which he will find wide open.

There will be no need for any witnesses

What in a beautiful style to put this! His record of deeds will be tied to his neck and it will be opened that day; and he will be told to read it himself: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ (17:14) – [and he will be told:] "Read this thy record,! And then: كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14) – Sufficient is your own self today to make out your account!" After this there will be no need for a prosecutor or witness or evidence. "You will give evidence against yourself; you will be your own witness; you will be your own prosecutor. There will

be no need to bring anyone else." This is a very beautiful and unique style to convince, my dear friends!

Shortcomings of the man-made justice system

The process the Quran has described above regarding justice and accountability for one's actions resides inside of human beings, whereas the system of justice of any society is based on external institutions and entities: such as courts, jury, witnesses, police, and prosecutor. That is why at every step there is a chance of error: an innocent person might get punished and a criminal might go free. If all these are within the man then there is no possibility that any criminal can go free; because everyone's record of deeds will be hanging in his neck. It is rolled up and hidden now but at that time (in the afterlife) would be opened up and he will be told to read it himself; be a witness against your own self; and give evidence against yourself. This is the unique style the Quran has adopted, my friends!

The next thing the Quran says about the Day of Judgment or the Day of Accountability is that it will happen in this world as well, if the society is established according to the Quranic values. In that case, individuals and the society as a whole will reflect the Quranic values. In whatever form our history has reached us, there are certain events that spring up as shining example of that Quranic society. Among these events from the period of the Prophet (PBUH)/Rightly-guided Khalifas is the one where someone came to report that he has committed a crime. No one saw him committing the crime. He himself realized and came to report it and asked that he be given appropriate punishment. He was told that in order to discharge judgment there was need for an eye-witness. He said that I am an eye-witness against myself. He knew that the punishment could be death. But he kept insisting that he should be punished according to the law. Is this not then, my friends, the same thing what the Quran says about reading one's own record of deeds; being a witness and giving evidence against one's own self; and doing one's own accountability.

My dear friends! If a society could be structured of this type then *this* will be the case. There would be deep conviction in the Law of Requital in the society. If someone happens to commit a crime then he will immediately reflect on it that there is no way he would escape punishment. That is the reason that person (mentioned above) came to report the crime against himself as reported in the history of the early period of Islam. We must have the Iman that accountability of our deeds is bound to occur in the Hereafter; and here in this world as well, when the society is established on the

basis of the Quran.

A plea for deciding the meaning of the Quran

My dear friends! The next 3-4 verses require some pondering. There are two types of meanings which come out after sufficient thought and understanding. The words are the same but one has to decide whether to take literal meaning or to take metaphorical meaning. I have mentioned many times in these lectures that in every language this is true: words have literal meaning as well as metaphorical meaning. The Quran also has this characteristic. An Arabic word has many metaphorical meanings. When deciding on a metaphorical meaning of a word in a verse, one has to have in front of him all other verses where that particular word has appeared. Putting all these verses together brings out the metaphorical meaning that is appropriate and fits well in that verse. Some past scholars took literal meaning of a word in a verse in isolation from other verses where that same word appeared. Now, if the verse is related to some concrete reality then its effect would not spread further and cause harm. But, if the verse was related to a commandment or a law, then the impact of taking a literal meaning would be far reaching and harmful. So, when it is told that the Quran is sufficient for our guidance; that it is a complete code of life and constitution – then it requires great thought and understanding in the Quran. In this process no help should be sought from any extra-Quranic sources. When the help to draw up the code of life has to be taken from within the Quran then we require people who have broad understanding and in-depth knowledge of the Quran. When all the verses of the Quran on a topic are collected together; and both literal and metaphorical meanings are considered in determining the appropriate meaning of a particular verse – then there is no verse of the Quran that remains unclear. That is the reason I have taken time today to explain this to you, my friends!

The time is over for today's lecture. The next 3-4 verses that are coming next require that we consider the above explanation I have provided about literal and metaphorical meanings.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆